علمی ادبی اور تنقیدی مصور ماہنامہ

کنول

مدیر

منظر صدیقی اکبر آبادی

خاص نمبر جنوری ۱۹۳۶ء

قیمت ۱۲ آنہ

ممالک غیر سے ۶ شلنگ
فی پرچہ ۵ آنہ

قیمت سالانہ ۳ روپے
ذریعہ وی پی ۳ روپے

مرکز اشاعت آگرہ

ادبِ اردو کا یہ نقشِ مصوّر

سلطنتِ دکن کے ماہِ تمام

یمین السلطنۃ ہز اکسیلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شاد

جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ای

کی علم نوازیوں اور ادب پرست نوازشات

کی مقدس کرنوں سے

معنون کرتا ہوں

بہ "کنول" دائم نگاہِ شاد باد

وز "کنول" چشمِ جہاں آباد باد

خاکسار۔ منظر صدیقی اکبرآبادی



اعلحضرت سعید الدولہ نواب مولوی حافظ محمد سعادت علیخان صاحب بہادر
سعید دام اقبالہ صولت جنگ جی-سی-آئی-ای تاجدار ٹونک

اُمّید کے ساتھ

اعلیٰ حضرت سعید الدولہ وزیر الملک نواب مولوی حافظ محمد سعادت علیخاں صاحب بہادر
سعید دام اقبالہٗ صولت جنگ جی سی۔ آئی۔ ای۔ تاجدار ریاست ٹونک

تم نے خنجر کو تو دیکھا ہے اک امید کے ساتھ — کچھ ادھر میں نے بھی سوچا ہے اک امید کیساتھ
دل کو مایوس بنایا ہے اک امید کے ساتھ — نا اُمیدی کی تمنا ہے اک امید کے ساتھ
دلِ ناشاد نہ یوں یاس سے گھبرا کہ ابھی — حال کیا کیا ترا ہونا ہے اک امید کے ساتھ
تم نہ آؤ گے تو آئے گی اجل آج ضرور — ایک امید بر آنا ہے اک امید کے ساتھ
ملنے والی خوشی بے مانگے بھی مل جائیگی — میں نے دامن کو سمیٹا ہے اک امید کے ساتھ
ہے یقیں یہ کہ وہ مایوس پہ کرتے ہیں کرم — میں نے نومیدی کو چاہا ہے اک امید کے ساتھ
وہی سائل جسے کچھ ملتا نہیں در سے ترے — ہاتھ خالی بھی تو جاتا ہے اک امید کے ساتھ
جب وہ انکار سے اُمید مری توڑتے ہیں — تو تعلق نکل آتا ہے اک امید کے ساتھ
تھی نظر اُن کی گلے پر تو مری خنجر پر — ایک نے ایک کو دیکھا ہے اک امید کے ساتھ
جن کے دل میں کئی اُمیدیں ہیں اُن سے کہدو — دیکھ لو حال مرا کیا ہے اک امید کے ساتھ

بزمِ اغیار سے اٹھنا نہ تھا دشوار سعید
درد نے اُٹھ کر بٹھایا ہے اک امید کے ساتھ

محشر دیکھتے

یمین السلطنت ہزاکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد
جی۔سی۔آئی۔ای۔کے سی۔آئی۔ای دام اقبالہٗ

بسملِ مژگاں تھا میں گر آنکھ بھر کر دیکھتے
وقتِ چارہ۔ چارہ گر رگ رگ میں نشتر دیکھتے

طور پر ہوتے تو ہم بھی یہ مقرر دیکھتے
برق گرتی دیکھتے موسیٰ کو ششدر دیکھتے

دیکھتے زیر و زبر کس طرح ہوتا ہے جہاں
تم جو شب کو اضطرابِ قلبِ مضطر دیکھتے

حشر کے میداں میں آجاتے جو کچھ شوریدہ سر
اہلِ محشر ایک محشر قبلِ محشر دیکھتے

ایسے بیخود کیوں ہوئے وارفتگانِ شوقِ دید
کوئی دم تو وہ نگاہِ ناز پرور دیکھتے

بیخبر کیوں قافلے والے ہیں منزل سے مری
میری گم کردہ رہی کو کاش مڑ کر دیکھتے

صاعقے کے ایک ہی جلوہ میں موسیٰ غش ہوئے
ایک دم تو وہ تجلی ریز منظر دیکھتے

یہ حقیقت ہے کہ سرشارِ مئے وحدت ہوں شاد
کاش اہلِ دل مرا مینا و ساغر دیکھتے



یمین السلطنت ہز ایکسیلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شاد
جی۔سی۔آئی۔ای۔کے۔سی۔آئی۔ای دام اقبالہ

تعارف

تصاویر:- (۱) اعلیٰحضرت نواب صاحب ٹونک دام اقبالہٗ — (۲) ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر
(۳) موجِ تصور (سہ رنگی) — (۴) انطون چیخوف — (۵) حضرتِ مولانا سیماب اکبر آبادی
(۶) حضرتِ صبا رشیدی ایم اے — (۷) حضرت میکش اکبر آبادی — (۸) وداعِ بہار (سہ رنگی)

جلد ۲ | خاص نمبر جنوری ۱۹۳۶ء | نمبر ۱

شذرات

آج میں دوسرے متعلقاتِ شعبۂ ادب سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف "کنول" کے لئے اور بالخصوص خاص نمبر کے لئے کچھ لکھنا چاہتا ہوں، کچھ تو اس لئے کہ ایک ماہ کی طویل و شدید علالت نے مطالعہ کا موقع ہی نہیں دیا اور کچھ اس لئے کہ میں اپنے کمزور قویٰ اور کم مائگیٔ علم و ادب کے ساتھ دو ہفتہ کے قلیل عرصہ میں "خاص نمبر" کے "رسمی" نام سے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کا جو سرمایۂ ادب پیش کر رہا ہوں اور پھر اس کی تکمیل جس عجلت و برق رفتاری سے ہوئی ہے اس کے پیشِ نظر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک "معجزہ" ہے یا پھر قدرت کے عطا ہی عطیاتِ شعر ساماں کا فیض و تصرف، اس وقت جبکہ میں شذرات لکھ رہا ہوں اور خاص نمبر کے تمام اوراق گلہائے رنگارنگ کی طرح میری نگاہوں کے سامنے بکھرے ہوئے ہیں، آپ کو بتا نہیں سکتا میں کس قدر مسرور ہوں۔ اور یقین رکھتا ہوں کہ ان کے مطالعہ کے بعد آپ بھی اتنے ہی مسرور ہوں گے۔

خاص نمبروں کی رسمِ جاریہ نے گو اب "وبائی" شکل اختیار کر لی ہے اور میرے نزدیک یہ چیز ترقیٔ ادب کے لئے اضافہ خیز نہیں مگر پھر بھی ملک کے بعض ممتاز اور سنجیدہ رسائل اس ذیل میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ خوش قسمتی سے کنول نے اپنی عمرِ مختصر میں جو شہرت اور دنیائے ادب میں جو درجہ حاصل کر لیا، اُس کا یہ حاصل میرے لئے بہت ہی صبر آزما ثابت ہوا کہ جنوری میں مجھے بھی "خاص نمبر" نکالنا چاہئے اور پرستارانِ "کنول" کے اس مطالبے نے کچھ ایسی اہمیت حاصل کی کہ مجھے مجبوراً دسمبر کے کنول میں خاص نمبر کا اعلان کرنا پڑا اور گو ایک ششماہی کے محاسبہ کے انجام (جو سات سو روپیہ کے نقصان کی صورت میں بے نقاب ہوا) نے دل و دماغ کو چکرا دیا تھا مگر دماغ خاص نمبر کے تصورات میں دوڑنے لگا اور تمام دوسری فکروں پر خاص نمبر کی فکر غالب ہو کر رہ گئی۔

اللہ کے بھروسے اور ادبی رفیقوں کی نوازشات کے سہارے پر خاص نمبر کا کام شروع بھی کر دیا گیا مگر فطرت کی ستم ظریفی بہ ایں صورت ظاہر ہوئی کہ خاکسار عین عید کے دن سے بیمار ہوا اور وسطِ جنوری کے بعد تک بستر سے اٹھنے کے قابل نہ ہو سکا اور جب [illegible] جنوری کے اختتام میں ایک [illegible] تھا۔ گو کمزوری ابھی چلنے کی بھی اجازت نہ دیتی تھی مگر انتہائے ذوق نے میرے قویٰ میں پر لگا دیئے اور ایک قلیل ترین [illegible]

...شمارہ آپ کے سامنے خاص نمبر کی شکل میں موجود ہے۔

کنول کے خاص نمبر کی ترتیب و تدوین اور تکمیل میں جہاں میرے کمزور قویٰ مصروفِ عمل رہے وہاں میرے بعض احباب اور بزرگوں نے بھی میری امداد و ...فرمائی ان حضرات میں مولوی خادم اللہ اکبرآبادی حضرتِ مولانا سیماب اکبرآبادی محمد الیاس صاحب حضرتِ آہر القادری۔ حضرتِ سعادت حسن انجم ...میرے چھوٹے بھائی عزیزی بھیا سجاد حسین بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

سعادت صاحب نے حضرتِ فیض آرٹسٹ سے خاص نمبر کا ٹائٹل بنوایا اور مضامین کی فراہمی کے لئے بھی کوشش فرمائی ہیں نہ صرف ان کا شکرگزار ہوں بلکہ مجھ سے اور کنول سے انہیں جو خلوص ہے اس کا اعتراف بھی کرتا ہوں۔ اسی طرح میرے مخلص دوست محمد خلیل صاحب ساغر رفیقی اکبرآبادی مالکِ ماہِ عام پریس نے جس تندہی، توجہ اور محنتِ شدید سے کنول کی طباعت میں حصہ لیا وہ نہ صرف ان کے ذوقِ فنِ طباعت کا ترجمان ہے بلکہ اس کا روشن ثبوت کہ وہ دلدادۂ ادب ہونے کے ساتھ ساتھ کنول سے انتہائی طور پر مانوس ہیں - اس نوع کے دوسرے تمام ...معاملات میں بھی ان کا ذوق کارفرما نظر آتا ہے۔

اس نمبر کے مضامین کے متعلق مجھے کچھ لکھنا تو چاہئے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی لیکن اس سلسلے میں نئی بات یہ ہے کہ خاص نمبر کے تمام مضامین نظم و نثر خاکسار کی بیمار نظروں کے علاوہ اپنی افادی و ادبی حیثیت سے نہ صرف ممتاز ہیں بلکہ خاص نمبر کو واقعی طور پر خاص نمبر بنا رہا ہے۔ میں کنول کے تمام معاونین و رفقا کی نوازشات و توجہات کا بے حد ممنون ہوں مگر قارئینِ "کنول" سے مجھے شکوہ ہے کہ ان کی عدم توجہی ہنوز دور نہیں ہوئی۔ تاہم یہ شکوہ ابھی شکریئے کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ کیونکہ ممکن ہے خاص نمبر کے مطالعہ کے بعد قارئین کی بے نیازیاں کنول کے آئندہ ...توجہات کے لئے خوشگوار ثابت ہو سکیں۔

میں اپنے ان تمام احباب اور محبانِ خصوصی کا ممنون ہوں جو میری بیماری کے زمانے میں پرسشِ حال فرماتے رہے اور جنکا اظہارِ خلوص و التفات ...تسلیم مجھ کو رہا ہے کہ دنیا ابھی مخلصین سے خالی نہیں ہے۔

مجھے اپنی زندگی سے زیادہ کنول کی زندگی کے استحکام کی فکر ہے۔ کیونکہ میرے نزدیک دیوانگیٔ خدمتِ ادب میں گھلتے گھلتے مرجانا ہی حقیقی ...زندگی ہے اس لئے میں بغیر کسی اندیشے کے کنول کے تمام معاونین و قارئین کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ اس ذیل میں مجھے کبھی لب کشائی ...کنول کو اپنا سمجھتے ہوئے اس کی اشاعت و اعانت سے کبھی چشم پوشی نہ فرمائیں۔

منظر

گلبانگِ نوشانوش

اُٹھا ساغر کہ بیداری وبالِ ہوش ہے ساقی
زمانہ تیغ در دست و کفن بر دوش ہے ساقی

ترے آزادہ مشرب روزہ دارونکی تمنا میں
ہلالِ عید اک کھُلتا ہوا آغوش ہے ساقی

خدا جانے چھپا ہے مشغلہ کیا بادہ خوارونمیں
زمیں سکتے میں ہے اور آسماں خاموش ہے ساقی

پسینہ آگیا ہے خلد میں حورونکے ماتھے پر
حسینونکی جوانی آج یوں گلپوش ہے ساقی

اگر اک بوند ٹپکا دوں تو لَو دینے لگے دُنیا
مرے ساغر میں ایسا بادۂ سرجوش ہے ساقی

زمانہ رقص میں ہے بج رہی ہے حریت کی چھاگل
چمن میں آج وہ گلبانگِ نوشانوش ہے ساقی

زمیں کے آبگینے کو کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے
ترے رندونکو مستی میں بھی اتنا ہوش ہے ساقی

اُٹھا لے جامِ زر اس کو پلا جامِ سفالی میں
کہ یہ کونین کو ٹھکرانے والا جوش ہے ساقی

جوشؔ ملیح آبادی

موجِ تصوّر

اے بحرِ مواج ٹھہر جا
کل نہ ٹھہرنا، آج ٹھہر جا
اس دُنیا پر، اس دھرتی پر
تیرا جم جم راج، ٹھہر جا
پریم نگر کے سپنے میں ہے
نظروں کی معراج، ٹھہر جا
دیکھ وہ چمکا، جیسے اُجالا
دُھندلا دُھندلا پریم شوالا!

آنسوؤں کے کچھ پھول بنا کر
سیپیوں سے موتی ٹپکا کر
موج سے لیکر عود اور عنبر
دُکھیا من کا دیپ جلا کر
پریم شوالے کی پوجا کو
لے جاؤں اک تھال سجا کر
اور چڑھاؤں پریم کی مالا
وہ آپہنچا پریم شوالا!

موجوں میں حسنِ خوابیدہ
ابر میں جیسے ماہِ پریدہ
آنکھوں میں خوابوں کی دُنیا
چتون رنجیدہ رنجیدہ
پریم نگر کا سفر کٹھن ہے
پریت کا رستہ ہے پیچیدہ
جگ مگ جگ مگ رنگوں والا
دیکھو وہ چمکا پریم شوالا!

پریم شوالے تک پہنچا دے
اب تو کشتی پار لگا دے
تھکے مسافر، دُور ہی آتا!
دُکھ سے سُکھ کی لہر ملا دے
چین سے جیون کے دن گذریں
اس مندر تک ناؤ بڑھا دے
ناؤ مگر اس کو در نہ بڑھا لا
آیا میرا پریم شوالا!

چھپا شوالہ پرگھٹ ہوکے
ہائے تصوّر، تیرے دھوکے!

پھر وہی موجیں پھر وہی دریا
رہ گیا سپنا، تیر چھو کے
رات سے کہدو اسکو تھامے
صبح سے کہدو، اسکو روکے
اُڑگیا جیسے روئی کا گالا! پریم شوالا! پریم شوالا!

(مثالی تصویر)

سیماب اکبر آبادی



موجِ تصور

معرکہ ــــ "چاند، کنول، عورت"

تقابلِ جمال و شباب ــــ ایک دلچسپ تجزیہ

(ابتدائے تخلیق عالم کا پہلا رومان)

مشہور شاعر کالیداس کی ایک شاہکار نظم کا نامکمل پلاٹ سننے کے بعد"

منعقد تھا جشنِ نوروزِ شبابِ زندگی
تھے زمین و آسماں مستِ شرابِ زندگی
حسن تھا خلوت گزیں و عشق تھا جلوہ فشاں
تھیں ہر اک جانب سرور و نور کی موجیں رواں
فیصلہ ہونا تھا یہ کس سے محبت کیجئے
افتخارِ دلبری کس کو ودیعت کیجئے
میرِ محفل خود رہا تا دیر گرمِ گفتگو
ہو سکی لیکن نہ تکمیلِ نشاطِ آرزو
خامشی تھی اور اہلِ بزم تھے یکسر اداس
بار تھا دامانِ ہستی پر مسرت کا لباس
ناگہاں آیا کہیں سے شاعرِ رنگیں بیاں
دیکھ کر یہ جشنِ ہستی، مستیوں کا کارواں
چاہتا تھا نطق پیرا ہو نئے انداز سے
کُل محفل کو جگا دے گرمیٔ آواز سے
میرِ محفل نے کہا اے رازدارِ بامِ عرش
روح پرور ہوتے ہیں تیری منکشف پیغامِ عرش
آج ہم سب اک نئے مبحث میں ہیں الجھے ہوئے
منتخب کس کو کریں عشق و محبت کے لئے
سُن لیا شاعر نے خاموشی سے اس پیغام کو
ذہن میں بیدار کر کے قوتِ الہام کو
نطق پیرا ہو گیا یوں بے تکلف لے کے ساتھ
جلوہ گر کرتے ہیں نغمے وجد سا زینے کے ساتھ
اے جوانانِ شریکِ جشنِ ہستی السّلام
آؤ میں تم کو سناتا ہوں محبت کا پیام
یہ نہ قصّہ ہے، نہ افسانہ، نہ کوئی داستاں
اک نئی تحقیق ہے یہ میرا پیغامِ جواں
میں بھی آوارہ پھرا ہوں مدتوں اس فکر میں
زندگی کی جنتیں پنہاں ہیں کس کے ذکر میں

مرکزِ امید پہلے "چاند" میرا ہوگیا — میں نے یہ سمجھا کہ ہستی کا سویرا ہوگیا
آہ لیکن صبح ہوتے ہی ہوا یہ انقلاب — ہوگیا روپوش آغوشِ فلک میں ماہتاب
پھر وہی واماندگی تھی پھر وہی افسردگی — اک بھیانک خواب ہوکر رہ گئی پھر زندگی

ناگہاں اک دن کنارِ آب دیکھے کچھ "کنول" — مسکرائی روح، دل جھوما، گئی حالت بدل
صبح سے تا شام نظارے کی سرگرمی رہی — تھا مگر دل میں مرے اندیشۂ باطل ابھی
دفعتاً آثار دل پر مردنی کے چھا گئے — شام کے ہوتے ہی سب روشن کنول مرجھا گئے

اب کوئی سمجھے تو کیا سمجھے پریشانی مری — خود مرا اک مرثیہ تھی نغمہ سامانی مری
کردیا دل کو تغیر نے کنول کے سوگوار — چاند کا روپوش ہونا لے گیا صبر و قرار
اب نہ تھا پیشِ نظر کوئی محبت کے لئے — دل تک آ پہونچے تھے کچھ نالے شکایت کیلئے

دیکھتا کیا ہوں چلی آتی ہے اک بجلی رواں — چاند چہرے سے نمایاں، چال سے مستی عیاں
مست آنکھوں میں شگفتہ سینکڑوں تازہ کنول — صد بہاراں در کنار و صد گلستاں در بغل
میکدے لاکھوں لبِ لعلیں پہ لہرائے ہوئے — سرمگیں بالوں میں اندازِ جواں چھائے ہوئے
سر سے پا تک مستیٔ رعنا سے ہم آغوش تھی — پیکرِ ناز و ادا تھی مستیٔ سرجوش تھی
میں اُٹھا، قدموں پہ اُس کے دل کو قرباں کردیا — ذہنِ فطرت نے مری مشکل کو آساں کردیا
اب مرے دن ہیں منوّر اور راتیں ضوفشاں — صرف "عورت" ہی محبت کی حقیقی ترجماں
اس کو سبقت ہے کنول اور چاند پر یہ حور ہے — عرش بھی اس کے ہی جلووں سے سراپا نور ہے

دیکھئے وہ آرہی ہے جھومتی گاتی ہوئی
اپنے جلووں سے سُرور و نور برساتی ہوئی

منظر

سلطنتِ آصفیہ کا نامور بانی — ہندوستان کی تاریخِ انقلاب کے چند ورق

(نظام الملک آصف جاہ کے اجمالی حالات)

تاریخ کے صفحات شاہد ہیں، کہ مشاہیرِ عالم کی زندگیوں کا آغاز ایک ایسی منزل سے ہوتا ہے، جہاں گمنامی، تہیدستی، اور فقر و افلاس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا زمانہ ناسازگار ہوتا ہے، لیکن ان ہستیوں کی قوتِ عمل زمانے کی ناساعدت کی بساط الٹ دیتی ہے۔ یہ انقلابی نفوس اس جوش و حرکت کے ساتھ زندگی کی منزل میں بڑھتے ہیں کہ دنیوی مشکلات و موانع کے مہیب پہاڑ اُن کی ٹھوکروں سے ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں، یہ لوگ کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے، آگے بڑھتے ہیں اور منزلِ مقصود پر پہنچ کر دم لیتے ہیں۔ سلطنت آصفیہ کے بانی، آصف جاہ اوّل کا بھی اُن ہی اکابرین میں شمار ہے، جن کی زندگی معمولی عہدہ سے شروع ہوتی ہے، اور آخر کار دنیوی جاہ و عزت کے سب سے بڑے منصب پر پہنچ جاتے ہیں۔

قمرالدین خاں (آصف جاہ اوّل) ۱۴ ربیع الثانی ۱۰۸۲ھ میں پیدا ہوئے، آپ کی والدہ، شاہ جہاں کے مشہور وزیر سعداللہ خاں کی بیٹی تھیں۔ آصف جاہ کی ولادت کا مادۂ تاریخ " نیک بخت " ہے عالمگیر کا عہد علمی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اسلئے ملازمان بارگاہ سلطانی کی اولاد کی علمی تربیت کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا لہذا آصف جاہ نے بھی بڑی جانفشانی کے ساتھ تعلیم حاصل کی، مگر آپ کی طبیعت کا میلان فنونِ جنگ کی طرف تھا۔ جو آگے چل کر آپ کی ترقیوں کا ممد و معاون ثابت ہوا۔ ۱۰۹۴ھ میں آصف جاہ شاہ عالمگیر کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ چار صدی کا منصب بارگاہ خسروی سے عطا ہوا، دوسرے سال خطاب خانی ملا۔ ۱۱۰۱ھ میں ترقی ملی اور بہادر کے خطاب سے مشرف فرمایا گیا۔ ۱۱۰۲ھ میں شہنشاہ عالمگیر نے چین قلیچ خاں کا خطاب عطا کیا۔ بعض وجوہ کی بنا پر آصف جاہ اور اُن کے والد نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ میں کشیدگی ہوگئی۔ اس کشیدگی نے اتنا طول کھینچا کہ آصف جاہ کو شاہی لشکر میں ملازمت کرنا پڑی۔ ۱۱۰۹ھ میں ناگور میں حکومت کے خلاف فتنہ بپا ہوا۔ بادشاہ نے آصف جاہ کو اپنا خاص خنجر عطا کیا، اور مفسدوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ آصف جاہ نے چند ہی ایام میں مفسدین کی شرارتوں اور ریشہ دوانیوں کا قلع قمع کردیا۔ ۱۱۱۱ھ میں مرہٹوں نے سر اُٹھایا۔ بغاوتِ ناگور کے استیصال نے آصف جاہ کی فراستِ حربی کے نقوش بادشاہ کے قلب پر مرتسم کردئیے تھے۔ لہذا مرہٹوں کی سرکوبی کیلئے بھی آصف جاہ کو ہی بھیجا گیا، آصف جاہ نے مرہٹوں کا سارا دم خم توڑ مروڑ کر رکھدیا۔ ۱۱۱۴ھ میں بیجاپور کی نظامت تفویض کی گئی، بعد سرمہیج گھوڑا اسد باتھی

بارگاہ معلی سے عطا ہوئے۔ بیجاپور کی نظامت آصف جاہ کے اعزاز کو بہت کچھ بڑھایا۔ اور آپ کا شمار مشیران سلطنت میں ہونے لگا۔ ۱۱۱۵ھ میں شہنشاہ عالمگیر غازی نے آپ کو قلعۂ بیدر کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ بیدر کا قلعہ فن تعمیر کا شاہکار ہے، محصورین نے قلعہ کے غیر معمولی استحکام سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، شدت کے ساتھ مدافعت کی، تاہم آصف جاہ نے ایک پہاڑی پر قبضہ جما لیا۔ اب محصورین کے لئے مزید مدافعت بہت مشکل تھی، دونوں طرف سے زور کا مقابلہ ہوا۔ بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی، آصف جس گھوڑے پر سوار تھے مارا گیا، عالمگیر نے اپنی سواری کے گھوڑوں میں سے ایک گھوڑا عطا کیا اور ایک مرصع تلوار بھی عطا فرمائی۔

عالمگیر کی وفات

عالمگیری عہد کے آخر میں آصف جاہ بیجاپور کے صوبہ دار تھے۔ ۱۱۱۸ھ میں عالمگیر کا احمد نگر میں وصال ہوا شاہ غازی مرحوم کا تاریخ وصال "روح و ریحان وجنت نعیم" ہے جو آپ کی مغفرت کے لئے مبارک فال ہے۔ آصف جاہ کو اپنے مہربان آقا کی وفات کا شدید صدمہ ہوا۔ بادشاہ کے جنازے کے ساتھ آپ اورنگ آباد آئے اور شہر اورنگ آباد سے بارہ میل کے فاصلے پر خلد آباد میں، اورنگ زیب کی میت سپرد خاک کی گئی۔

اورنگ زیب کے مرتے ہی بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی یہ خانہ جنگی فی الحقیقت سلطنتِ مغلیہ کے زوال کا پیش خیمہ تھی آگرہ کے قریب شہزادہ معظم اور اعظم میں زبردست جنگ ہوئی۔ اعظم شاہ مارا گیا اور معظم شاہ تختِ حکومت پر جلوہ گر ہوا نئے بادشاہ نے "شاہ عالم بہادر شاہ" اپنا لقب تجویز کیا۔

آصف جاہ ان دنوں دکن میں تھے شاہ عالم کی تخت نشینی کے کچھ دن بعد آپ بلا لئے گئے بادشاہ نے چھ ہزاری ذات اور چھ ہزار سوار کا منصب، خطاب خان دوراں اور ماہی مراتب سرفراز کیا۔ علامہ عبدالجلیل بلگرامی نے "خان دوراں بہادر" تاریخ کہی۔

خلوت کے بعد پھر جلوت

نئے بادشاہ کے حاشیہ نشینوں اور دوسرے امراسے آصف جاہ کی ان بن ہوگئی آصف جاہ کا مزاج درویشانہ تھا اور طبیعت فقر و تصوف کی طرف مائل تھی، امرا کی ناچاقی نے طبیعت کو بہت متاثر کیا۔ لہٰذا آپ منصب سے دست بردار ہوکر، گوشہ نشین ہوگئے اور فقرا کا لباس پہننے لگے۔ اس عرصہ میں حکومت نے بہت پلٹے کھائے۔ شاہ عالم نے پنج سالہ حکومت کے بعد انتقال کیا۔ تمام شاہزادے آصف جاہ کی قوت و تدبر سے واقف تھے، اس لئے سب نے آصف جاہ کو اپنی طرفداری پر آمادہ کرنے کی ترغیب دی، مگر آپ نے انکار کر دیا اور گوشہ نشینی ترک نہ کی شاہزادوں میں تخت حاصل کرنے کے لئے شدید رقابت پیدا ہوگئی اور آخر کار اس رقابت نے ایک ہولناک جنگ کی صورت اختیار کی شاہ مرحوم کے فرزند اکبر معز الدین جہاندار کو تمام شاہزادوں پر فتح حاصل ہوئی اور غرہ ربیع الاول ۱۱۲۴ھ کو جہاندار شاہ تختِ حکومت پر متمکن ہوا جہاندار شاہ کے دہلی میں آنے پر آصف الدولہ جملۃ الملک نواب اسد خاں آصف جاہ کو سمجھا بجھا کر بادشاہ کی خدمت میں لے گیا اور آپ پھر اپنے قدیم منصب پر مامور ہوگئے۔ جہاندار شاہ، آصف جاہ کی جنگی قابلیت سے واقف تھا، اُسے قدیم و تجربہ کار کمانڈر کی شدید ضرورت تھی۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ نواب اسد خاں کی سلسلہ جنبانی میں، جہاندار شاہ کے اشارے کا بھی کسی نہ کسی حد تک دخل ہو۔

جہاندار شاہ کی شکست اور فرخ سیر کی تخت نشینی

حکومت مغلیہ انقلابات کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی، جہاندار شاہ کی گیارہ ماہ حکومت کے بعد پھر انقلاب کی آندھی چلی، جہاندار شاہ کو اس کے بھتیجے فرخ سیر نے شکست دی، وہ گرفتار ہوا اور دہلی کے قلعہ کی زمین جہاندار شاہ کے خون سے رنگین کی گئی۔ جہاندار شاہ کے بعد فرخ سیر ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ میں جمعہ کے دن تخت نشین ہوا۔ فرخ سیر کے سکوں پر مندرجہ ذیل بیت مسکوک تھی۔

سکہ زد از فضلِ حق بر سیم و زر بادشاہِ بحر و بر، فرخ سیر

فرخ سیر فطرتاً کمزور واقع ہوا تھا، ملکی معاملات کے سمجھنے کی اُس میں بہت کم صلاحیت تھی، اسی کا سبب تھا کہ قطب الملک حسن علی خاں اور امیر الامرا حسین علی خاں نے بادشاہ پر قابو حاصل کر لیا اور ان دونوں بھائیوں کے چشم و ابرو کے اشارے پر بادشاہت کی مشین کام کرنے لگی۔ فرخ سیر نے امرا کو بہت کچھ نوازا۔ آصف جاہ کو بھی برہان پور کا صوبہ دار بنایا اور نظام الملک فتح جنگ کا خطاب عنایت کیا۔

مرہٹوں کی سرکوبی

مغلیہ شاہزادوں کی خانہ جنگی نے مرہٹوں کے حوصلے بڑھا دیئے، فرخ سیر کے ابتدائی عہد میں مرہٹوں نے دکن میں پھر سر اُٹھایا، قطب الملک وزیر اعظم نے آصف جاہ نظام الملک کو اس مُہم کے سر کرنے کے لئے بھیجا۔ آصف جاہ جب دکن پہنچے، تو ہر طرف ایک بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی، اور مرہٹے ملک کے ہر حصے میں لوٹ مار کرتے پھرتے تھے، آصف جاہ نے مرہٹوں کی شورش پر بہت جلد قابو حاصل کر لیا اور تھوڑے ہی دن میں بدنظمی کا قلع قمع ہو گیا۔ دکن "لوہے کا چنا" بنا ہوا تھا، آصف جاہ نے اُسے "لقمۂ تر" بنا یا قطب الملک بھلا یہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ آصف جاہ کے کام و دہن اس "لقمۂ تر" سے لذت اندوز ہوں۔ اُس نے فوراً ہی بادشاہ کی طرف سے فرمان جاری کیا، امیر الامرا حسین علی خاں دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا اور آصف جاہ کو دہلی طلب کیا گیا۔ بادشاہ نے آصف جاہ کو بہت کچھ انعام و اکرام دیا اور آصف جاہ نے گیارہ لاکھ روپیہ گذرانے جو انھوں نے دکن کے جاگیرداروں سے وصول کیے تھے۔

فرخ سیر کا قتل

قطب الملک وزیر اعظم، کوئی شک نہیں کہ ایک زبردست مدبر اور لائق مشیر تھا۔ مگر اس کی کاہلی اور عیاشی نے اُس کے تدبر کے جوہر زنگ آلود کر دیئے، سارا کام رتن چند نائب پر چھوڑ دیا گیا۔ رتن چند بڑا دنی الطبع اور مفسد پرداز تھا اُس نے اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرخ سیر اپنی کامل خود مختاری کی اسکیم تیار کرنے لگا۔ قطب الملک بادشاہ کے تیور دیکھ کر کھٹکا، اور اس نے اپنے بھائی حسین علی خاں امیر الامرا کو خاندیش سے بلایا۔ جس کے بعد بادشاہ اور وزیر اعظم میں صلح ہو گئی عالم علی خاں کو اورنگ آباد میں مقرر کیا گیا۔

آصف جاہ دربار کا رنگ دیکھ کر بددل ہو گئے، وہ ان سازشوں سے دور ہی رہنا بہتر سمجھتے تھے، لہٰذا انھوں نے بادشاہ سے مراد آباد جانے کی اجازت مانگی، جو اُن کی جاگیر تھی۔ بادشاہ نے اجازت دیدی اور آصف جاہ جاگیر کی طرف سدھارے۔

فرخ سیر کے دل میں قطب الملک وزیر اعظم کی طرف سے گرہ پڑ گئی تھی، اس نے محمد مراد خاں کشمیری کو اعتقاد خاں کا خطاب دیا اور چاہتا تھا کہ قطب الملک کی جگہ اعتقاد خاں کو وزیر اعظم بنا دے۔ اس مشورہ کے لئے اُس نے مراد آباد سے آصف جاہ کو بلایا۔ آصف جاہ کے آتے ہی پہ بادشاہ

نے ایک مجلس مشورت طلب کی، جو آصف جاہ، جے سنگھ، راجہ جے پور، خان دوراں اور غازی الدین خاں پر مشتمل تھی۔ بادشاہ نے اپنا ارادہ صاف الفاظ میں ظاہر کیا کہ تم سب مل کر وزیر اعظم کو ٹھکانے لگا دو اور اس کی جگہ اعتقاد خاں کو مقرر کیا جائیگا، امرا نے بادشاہ کے مشورے سے اتفاق نہ کیا اتنے میں امیر الامراء دہلی آگیا اور اس نے فرخ سیر کو اپنے آدمیوں سے پکڑوا کر قتل کرا دیا۔ یہ واقعہ خونی ۱۷۱۹ء کو ظہور پذیر ہوا جبکہ مرہٹوں کی طاقتیں پوشیدہ طور پر بغاوت کا تنور گرم کر رہی تھیں فرخ سیر کے بعد سادات نے رفیع الشان کو تخت پر بٹھا دیا۔ جس نے رفیع الدرجات کا لقب اختیار کیا۔ فرخ سیر اگرچہ کمزور تھا لیکن اس میں خود مختاری کا جذبہ موجود تھا جس سے سادات کو بعض وقت دب کر رہنا پڑتا تھا مگر رفیع الدرجات تو سادات ہی کا بنایا ہوا تھا، وہ غریب ان سازشی لوگوں سے کب سرتابی کر سکتا تھا رفیع الدرجات برائے نام بادشاہ تھا، سیاہ و سفید کے مالک تو یہ دونوں بھائی تھے، جن کو تاریخ میں بادشاہ گر (King makers) کے نام سے یاد کیا گیا ہے

فرخ سیر کے قتل سے کچھ دن قبل قطب الملک کے تعلقات آصف جاہ سے خوشگوار ہوگئے تھے، رفیع الدرجات کی مسند نشینی کے بعد دونوں بھائیوں نے آصف جاہ کو اپنا حامی بنایا اور بہت کچھ خلوص محبت کا اظہار کیا لیکن یہ بھائی چارہ بہت دن قائم نہ رہ سکا آصف جاہ کے اقتدار اور ہر دلعزیزی سے دونوں بھائیوں کو کھٹکا تھا، لہذا آپس میں اختلاف شروع ہوگیا

آصف جاہ کو مالوہ کی صوبہ داری مل چکی تھی، قطب الملک کو آصف جاہ کی یہ سیادت خطرناک نظر آئی اس نے آصف جاہ کو شاہی فرمان کے ذریعہ دہلی میں طلب کیا فرمان میں لکھا گیا کہ مالوہ چونکہ دکن سے قریب ہے لہذا یہ صوبہ دکن کے صوبجات میں شامل کر کے امیر الامراء کے سپرد کر دیا گیا "تم دہلی آجاؤ، یہاں تم کو آگرہ کی صوبہ داری عطا کی جائیگی"

آصف جاہ نے اس فرمان کی جو در اصل سادات بارہہ کا مکتوب تھا تعمیل نہیں کی اور دکن کی طرف روانہ ہوگئے راستے میں خاندیس کا مشہور قلعہ آسیر فتح کیا، اس کے بعد برہان پور کی تسخیر عمل میں آئی

عالم علی خاں کی شکست

آصف جاہ نے برہان پور سے دکن کی طرف کوچ کیا اور یہاں عالم علی خاں سے ٹکر ہوئی عالم علی خاں نے جرار لشکر کے ساتھ جس کی تعداد تیس ہزار بتائی جاتی ہے مقابلہ کیا عالم علی خاں کے سپاہیوں نے جانبازی کا ثبوت دیا مگر آصف جاہ کی جاں نثار فوج نے خون میں نہا کر فتح کا علم بلند کیا عالم علی خاں مارا گیا، اور اس کے مرتے ہی فوج تتر بتر ہوگئی۔ عالم علی خاں کی شکست نے آصف جاہ کی سیادت دکن پر مہر توثیق ثبت کر دی آصف جاہ نے اورنگ آباد پہنچکر اپنے رفقا اور ساتھیوں کو بہت کچھ نوازا جلیل القدر مناصب عطا کئے جاگیریں دیں، خطابات دیئے خلعت فاخرہ بخشے۔

سادات بارہہ کی تباہی

عالم علی خاں کی شکست نے سادات کے زور کو توڑ دیا ادھر برہان الملک سعادت خاں فرخ سیر کے خون کا بدلہ لینا چاہتا تھا برہان الملک اپنے اس ارادہ میں بہت جلد کامیاب ہوگیا، اور میر حیدر خاں کے ہاتھوں امیر الامراء کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد بادشاہ اور قطب الملک عبداللہ خاں کی فوجوں میں جھڑپ ہوئی قطب الملک لڑائی میں ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ فوج نے سمجھا کر عبداللہ خاں مارا گیا۔ لہذا فوج بھاگ نکلی اور عبداللہ خاں گرفتار ہو کر بادشاہ کے

میں لایا گیا، اور دوسرے ہمراہیوں کے ساتھ قید میں ڈال دیا گیا۔

...پر آصف جاہ کا قبضہ

سادات بارہہ کے زوال کے بعد آصف جاہ کا راستہ بالکل صاف ہوگیا، بادشاہ نے آصف جاہ کی بےحد قدر دانی کی، وزارتِ کل کا جلیل القدر عہدہ اُن کو عطا کیا۔ سرپیچ، جیغہ، مُرصّع قلمدان اور ...کی بیش قیمت انگشتری مرحمت کی، اور سعد اللہ خاں کی حویلی رہنے کے لئے دی۔

...زارت کے بعد آصف جاہ کو انقلابات کی پُرخار وادی سے گذرنا پڑا۔ بادشاہ اور اس کے مصاحبوں سے ناچاقی ہوگئی۔ اس کے بعد ...کے مشیروں نے آصف جاہ کو حیدر قلی خاں سے لڑوا دیا۔ بڑی کشمکش کے بعد آصف جاہ کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اس عرصہ میں آصف جاہ ...رسے علیحدگی بھی چاہی۔ اور اُس کے بعد خوب زور کے معرکے بھی ہے۔ آصف جاہ کا بڑا کارنامہ کرناٹک کی تسخیر ہے۔

اس کے بعد آصف جاہ نے حیدرآباد کو دکن کا دارالحکومت قرار دیا اور مقررہ اوقات پر تحائف اور نذرانے بادشاہ کی خدمت میں بھیجتے ...رقلمرو سے دکن کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا بادشاہ کو آصف جاہ کی یہ خود مختاری ناگوار تھی، مگر کیا کرتا، خاموشی کے ساتھ زمانہ کی ...ں دیکھتا رہا اور نذر و تحائف ہی کو غنیمت سمجھا

...کا قتل عام

مرہٹوں نے دکن میں پھر بغاوت کے شعلے بلند کئے۔ لیکن آصف جاہ کی تدبیر کے بادلوں نے ان شعلوں کو جلد ٹھنڈا کر دیا اسی عرصہ میں نادر شاہ کی دہلی پر چڑھائی کا واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ جس کو ہندوستان کی بدقسمتی کا شاید دیباچہ کہا جائے ...نہ ہوگا۔ دہلی کی گلیاں خون سے لال ہوگئیں اس موقع پر بھی آصف جاہ کی تدبیر کارگر ہوئی اُدھر شہر میں قتل عام جاری تھا ادھر آصف جاہ ...دگلے میں حمایل کرکے ننگے سر نادر کے سامنے کھڑے ہوگئے، نادر نے پوچھا "چہ میخواہی" آصف جاہ نے جواب میں کہا:-

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کُنی خلق را و باز کشی

نادر یہ شعر سُن کر شرما گیا، تلوار کو میان میں کرکے بولا "بریش سفیدت بخشم"، نادر کا تلوار کا میان میں کرنا تھا کہ چاؤشوں نے ایرانی سپاہیوں ...دی اور قتل کا بازار سرد پڑ گیا۔

اس کے بعد خود آصف جاہ کے بیٹے ناصر جنگ نے باپ کے خلاف علمِ بغاوت علم بلند کیا۔ باپ، بیٹے میں شدید جنگ ہوئی، ناصر جنگ گرفتار ہوکر ...کے حضور میں آیا۔ خطا شدید تھی، مگر محبت پدری نے جوش مارا اور ناصر جنگ کی خطا معاف کی گئی۔

...فات

آصف جاہ بڑھاپے میں معدے کے مریض ہوگئے تھے، محنت سخت کرتے تھے اور پرہیز کی طرف سے لاپروا تھے، جس کی وجہ سے امراض کا غلبہ ہوتا گیا۔ ایک مرتبہ بارش اور نالوں میں کوچ کرنا پڑا، جس کے باعث طبیعت بہت بگڑ گئی اور ۵ جمادی الآخر ۱۱۶۱ھ کو اس ...رت شخص پر موت نے غلبہ پالیا، جس کی تلوار کی جھنکار سے قلعۂ معلیٰ کی دیواریں کانپتی تھیں۔ ناصر جنگ نے لاش کو تابوت میں رکھکر خیمہ میں بطور امانت دفن کرا دیا۔ اور بعد میں اس تابوت کو خلدآباد میں سپردِ خاک کر دیا۔ وفات کے بعد آپ کو "مغفرت مآب" کے لقب سے یاد کیا گیا۔

ذوقِ شعر و سخن آصف جاہ بڑے سیرچشم اور علم دوست تھے، اپنے رفقائے کار اور جاں نثاروں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتے تھے۔ اسی چیز نے سرفروشوں کی ایک بڑی جماعت پیدا کردی، جن کے بل بوتے پر آصف جاہ نے مغلیہ حکومت کے مقابلے میں دوسری حکومت کی بنیاد ڈال دی۔

آصف جاہ کو شعرگوئی کا بھی شوق تھا، شروع میں شاکر تخلص تھا، پھر آصف کر دیا۔ آپ کے کلام سے طبیعت کی جودت، خیالات کی بلندی اور رفعت زبان کا پتہ چلتا ہے۔ چند منتخب اشعار درج ذیل کیے جاتے ہیں

عاشق ز موجِ گریہ دلے شاد می کند — برشئے آب خانہ آباد می کند
شوخے کہ برنجد از سلامے — مشغول دعا شدن چہ مشکل
سودائے خام سوز زیاں آفت دلی ست — وا بستہ در پناہِ توکل نشستہ ایم
آصف بہ بزمِ لالہ عذاراں ز بیم غیر — چوں غنچہ با ہزار تامل نشستہ ایم
محو شش شدہ ام دگر ندانم — دل از کفِ من ربود یا نہ
لے کہ حُسن خویش زیبائی
جاں فزائی چو ناز فرمائی

ماہر القادری

چاند تارے

یہ ماہ جبیں یہ ماہ پارے کیا ہیں — فردوسِ سما میں یہ شرارے کیا ہیں
حیرت زدہ ہے نگاہِ عالم اے راز — معلوم نہیں کہ یہ نظارے کیا ہیں

یہ گلشنِ پُربہار، باغِ فطرت — اک ایک چمن ہے جس کا رشکِ جنت
دادِ تحقیق دے رہی ہے دُنیا — کھلتا ہی نہیں مگر طلسمِ قدرت

اے صاحبِ عقل و ہوش حیراں کیوں ہے — بے وجہ، بلا سبب پریشاں کیوں ہے
آ! راز کی بات میں بتاؤں تجھ کو — سرگشتہ مثال چرخِ گرداں کیوں ہے

یہ منظرِ سحر کارِ بزمِ فطرت — نظارے سے جس کے ہے جہاں کو حیرت
حسنِ قدرت کی ہے کرشمہ سازی — اتنا ہی سمجھنے کی ہے تجھ کو حاجت

راز چاندپوری

ہولناک تبدیلی

ایک زینہ ہے اِدھر میرا مکاں ہے، اور اُدھر
کچھ دنوں سے آ کے ٹھہرا ہے کوئی شخصِ دگر

رات کو زینے سے آئی مست سیٹی کی صدا
سُن کے اُس سیٹی کو میری زندگی نے یہ کہا

تجھ سے ملنے کے لئے یہ شخص آ سکتا نہیں
اب یہاں ذوقِ جوانی بار پا سکتا نہیں

اب تو آئیں گے اِدھر لے دے کے اربابِ کلیم
سُست چہروں پر صحافت کا لئے بارِ عظیم

تند مطبع کی ہزاروں جھڑکیاں کھائے ہوئے
کاتبوں کے دو رخی وعدوں سے گھبرائے ہوئے

زندگی کے جادۂ آرام سے بھٹکے ہوئے
اچکنوں کے دامنوں کی طرح مُنہ لٹکے ہوئے

آئے گی جن کے شکن آلودہ ماتھوں سے صدا
"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

کام کی باتوں سے وہ ہر آن جنگیں کیا ہوئیں
ہائے وہ بیکار باتوں کی اُمنگیں کیا ہوئیں

جوشؔ سا انسان فکروں سے کچل کر رہ گیا
ہائے کیا میخانہ دفتر میں بدل کر رہ گیا

جوشؔ ملیح آبادی

فسانہ نگار عالمِ سکرات میں

(تبصرہ نظامِ حیات)

میں کیا سُن رہا ہوں! میں مر رہا ہوں! میری سانس اکھڑ رہی ہے دم نکل رہا ہے — کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر! کیا یک سب ہو تو ؟ شانتی! شانتی یہ کس زبان کا لفظ ہے، میں نے اسے کبھی نہیں سُنا، میں اس لفظ کے معنی نہیں جانتا، پھر ایسی مہمل باتیں میرے سامنے کیوں کر رہے ہو؟ — تم کیوں رو رہے ہو؟ شاید اتنا کم ہمت نہیں ہوتا! میں مر نہیں رہا ہوں میں کبھی نہ مروں گا، میں قوم کا ترجمان ہوں، میں فسانہ نگار ہوں، شاعر ہوں، مادرِ وطن کا ایک عالی خیال سپوت ہوں میں قومی ذہن کا رہنما ہوں، میں کبھی نہیں مر سکتا ——— یہ کون ہے میرے سامنے؟ میری نگاہوں میں یہ کون گھسا جا رہا ہے ——— پتاجی! کون پتاجی؟ میرے باپ، جنہوں نے مجھے اپنی گودوں میں پرورش کیا تھا؟ جنہوں نے کبھی میرے آرام اور میری خوشی کے لئے دن اور رات ایک کر دیا تھا، جو میری بیماریوں میں اپنا عیش اور اپنا سکون تلخ کر دیا کرتے تھے؟ جو مجھے خوش دیکھنے کے لئے تڑپا کرتے تھے؟ جنہوں نے مجھے بہترین تعلیم دلانے کی کوشش کی؟ جنہوں نے کسی زمانہ میں میری ہمت افزائی کرنا اپنا ایمان بنا لیا تھا؟

جنہوں نے کبھی میری گستاخیوں کی پرواہ نہ کی تھی؟ جو کبھی میری خاطر مصیبتوں میں گرفتار ہوئے تھے؟ جنہوں نے ایک حد تک میری ہر ضد بغیر سوچے سمجھے پوری کی تھی؟ جنہوں نے میرے اصرار سے مجبو ہو کر کم عمری میں ہی میرے شکستہ رومان کو اپنی صداقت بھرے ایما سے جوڑ دیا تھا، جنہوں نے میری اسوقت مدد کی تھی جب میں سما کی گرفت میں تھا، جب مجھ پر مذہب اور دھرم کے ٹھیکیدار ورں فتویٰ مارا ہو گیا تھا اور میں خودکشی یا خودکشی کی تیاری کر رہا ——— وہی پتاجی جنہوں نے مجھے پردیس سے کبھی بلوایا مجھے مطمئن کیا تھا اور ایک دیوی کی رفاقت مجھے بخشی تھی؟ ——— کیا یہ وہی پتاجی ہیں جنہوں نے زندگی کے مد و جزر میں ہمیشہ میرا سا تھ جنہوں نے میری فضول خرچی، تلون مزاجی، میری بیباکی کیفیا میں بھی میرا ساتھ دیا تھا؟ ——— نہیں نہیں غلط کہتے تم سب جھوٹے ہو، تم سب مجھے بہلاتے ہو ——— ڈاکٹر! ڈا ہٹ جاؤ، میرے پاس سے چلے جاؤ، تم بھی ان لوگوں کو نہیں میں کیا مجرم ہوں کہ تم مجھے جکڑے ہوئے ہو؟ اور میں کیا کوئی تما

کہ یہ سب میرے گرد جمع ہیں؟ ——— نیلی آنکھوں والی ساکی! تو بھی انھیں
نہیں سمجھاتی! تو میری ہمدرد تھی، تجھ کو میں نے مسلسل کئی راتوں سے اپنے
بستر پر دیکھا ہے، میں نے مسلسل تیری "جوان خوشبو" سونگی ہے،
میرے رخسارے تیری لطیف تھپکیوں کو نہیں بھولے ہیں "جرعات نرگس"
پلاتے ہوئے تیرے جھکتے ہوئے ننھے ہاتھوں کا وہ لمس مجھے نہیں بھولا
ہے جو مجھ پر کیفیتِ بیخودی طاری کر دیا کرتا تھا، پھر تو انھیں کیوں نہیں
منع کرتی، تو ان سے کیوں نہیں کہتی کہ میرے پاس سے چلے جائیں؟
میری نظروں سے دور ہو جائیں، انھوں نے تمام عمر مجھے فریب میں مبتلا
رکھا، یہ بھی ایک فریب ہے، میرے اس روحانی سفر میں بھی یہ مجھے
فریب کی چوٹ دینا چاہتے ہیں ——— یہ شبیہ میرے باپ کی نہیں
ہوسکتی، کم ازکم یہ صورت میرے اُس باپ کی نہیں ہے جو آج سے کچھ دن
پہلے میرا دیوتا تھا، میرا خدا تھا، میرا سب کچھ تھا، میرا وہ باپ، وہ باپ
یہاں اس وقت کیسے ہوسکتا ہے، مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ مجھے "الوداع"
کہنے آیا ہو ——— آپ کون ہیں؟ بزرگ محترم! آپ کون ہیں؟ میرے
باپ کی آنکھیں آپ کے پاس کہاں سے آئیں؟ میرے باپ کی بلند پیشانی
آپ کہاں سے لائے؟ میرے باپ کا یہ تبسم آپ کہاں سے چرا لائے؟
میرے باپ کے یہ آنسو، ہمدردی کے یہ تابدار موتی، آپ کیسے حاصل
کرسکے ہیں ——— مجھے دھوکا ہو رہا ہے، آپ کی پیشانی پر ویسی ہی
شکنیں ہیں، آپ کی آنکھوں میں وہی پر اسرار شفقت موجزن
نظر آتی ہے، آپ کے ہونٹوں پر پیار ویسے ہی رقص کناں ہے
آپ کے ہاتھوں کی تھرتھراتی ہوئی تھپک بھی ویسی ہے اور یہ
ٹھنڈی ٹھنڈی سانس، یہ گرم و سرد آہ کے جھکے بھی ویسے ہی ہیں
——— کیا آپ واقعی میرے باپ ہیں؟ ——— جھوٹ بالکل جھوٹ
فریب قطعاً فریب ——— نہیں اب میں فریب میں نہیں آسکتا

——— نرس! میری شب بیدار حسینہ بتاؤ یہ کون [illegible]
تو نہیں ہے؟ یہ میکائیل تو نہیں ہے؟ جبرئیل؟ جبرئیل بھی یہ نہیں ہے
اب مجھے کسی تازہ الہام کی ضرورت نہیں ہے، میرے گوشت
کے پارے ہی زرافشاں ہونے کو ہیں، اب میری قوم مجھ سے کسی
صحیفہ کی طالب نہیں ہے، میری پریم کتھا، میرے آنسوؤں کے قطرے
تمام مذہبی کتابوں اور صحیفوں پر بھاری ہیں ——— یہ جبرئیل نہیں، جبرئیل
جبرئیل کو میرے پاس آنے کی اب ضرورت نہیں ہے ——— تم پھر کہہ رہی
ہو کہ یہ میرا باپ ہے! میرا باپ یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ میرے باپ
نے تو مجھے عاق کر دیا تھا، میرے باپ نے تو مجھے رسم و رواج سے مجبور
ہو کر، اپنی وجاہت کے خیال سے مجبور ہو کر اپنے خاندانی وقار سے متاثر
ہو کر، حسب و نسب کے اعتبارِ قدیم میں پھنس کر مجھے، ہاں ہاں مجھے
اپنے جگر کے ٹکڑے، اپنی آنکھوں کی روشنی، اپنی دل کی راحت
اپنے فرزند ارجمند کو عاق کر دیا تھا ——— میرے باپ ———
میرے باپ نے تو مجھے دلی کے تخت پر فرماں روائی کرتے ہوئے فو
بھیجا تھا کہ میں اب انھیں اپنی صورت نہ دکھاؤں ——— "آخری سا
کا فرمان ——— تم سب کیوں رو رہے ہو؟ نرس! ان کے چہرو ں
ہوائیاں کیوں چھٹ رہی ہیں، میں جھوٹ نہیں کہتا ——— میں
کہتا ہوں جب میری شریکِ حیات روحانی دیوی کو شہنشاہی وا
اپنی ملکہ بنا کر میرے پاس سے لے گئے اور میں نے ایک مدت اُن کی
میں بسر کی تو میرے باپ نے مجھے بہلانے کی ہر طرح کوشش
تھی مگر ——— مگر اجڑی ہوئی زندگی کے غیر منظم طریق [illegible]
طبیعت میں سیمابی کیفیت پیدا کر دی تھی [illegible]
پہنچ گیا تھا ——— میں ——— ہاں تمہارا [illegible]
——— روپیہ کو ٹھیکریاں سمجھ کر پھینکتا [illegible]

اپنا مقصد فوراً ہی میرے لئے — میرا باپ — اپنا مقصد خود ادھی میرے لئے، جگہ کون پہونچانے کیلئے خالی کر رہا تھا — باوجود اس کے مجھے یقین ہے کہ یہ سامنے سسکیاں بھرتے ہوئے قبلہ و کعبہ، یہ متحرک فرشتہ — میرا باپ نہیں ہو سکتا — کیونکہ میرے باپ نے مجھے ان آخری دنوں میں ہی عاق کر دیا تھا — تم سب کیوں حیران ہو ہو کر مجھے دیکھ رہے ہو، نرس! تم بار بار پہلو کیوں بدل رہی ہو تمہیں اپنے قدیم رنگین ایام کی یاد ستا رہی ہے تو میرے پاس سے چلی جاؤ — میں صحیح کہہ رہا ہوں — صحیح — صحیح ڈاکٹر — مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوئی — اس لڑکی سے وہ جو میرے پائنتی بیٹھی ہوئی پریم کے آخری دو بھرے جام مجھے پلا رہی ہے — اسی لڑکی سے — تم سب نے اسے یہاں اپنے پاس کیسے جگہ دی؟ — وہ اچھوت ہے — میرے باپ نے اسے اچھوت سمجھ کر ٹھکرا دیا تھا — وہ اس ماں کی لڑکی تھی جو دیوداسی ہندو سے مسلمان بیگم بنی تھی — جس نے ایک بڑے باپ کے نالائق — ہاں میرے ہی ایسے نالائق لڑکے سے نکاح کر لیا تھا — میرا جبریل کہتا تھا کہ ان کا نکاح خالق اعظم کی بارگاہ میں قبول ہوا تھا اور وہ سامنے بیٹھی ہوئی میری راحت اسی تعلق جائز کا نتیجہ تھی — پھر بھی وہ سیّد نہیں ہے، — وہ مورثوں کے اس خاندان کی نہیں ہے جو شیردل مغلوں سے بھی پہلے یہاں آئے تھے، جن کے علم و جاہ کا ڈنکا سارے اقصائے عالم میں بجا ہوا تھا — اس کی ماں خاندانی طور پر شریف نہیں ہے. اس کے حسب و نسب کی کوئی تاریخ نہیں ہے — اس کی پچھلی زندگی کا کوئی مقام موجود نہیں ہے — اس لڑکی کا یہی قصور تھا کہ یہ ایسی ماں کے پیٹ سے کیوں پیدا ہوئی؟ یہ کسی جعفری الزیجی کے یہاں کیوں نہیں پیدا ہوئی؟ یہ کسی سیّدہ منظر کی دختر نیک اختر کیوں نہیں ہوئی؟ — نہیں! نہیں — یہ اس سے زیادہ — یہ اس سے بہت زیادہ گنہگار تھی — اس کا قصور یہ بھی تھا کہ یہ ایک نرس کی لڑکی تھی — یہ بھی اس کا جرم تھا کہ سوسائٹی کے اس فرعونِ اعظم کی آنسۂ جمیل کیوں نہیں ہے جو محلات میں رہا کرتا ہے؟ — جو زر و جواہر کے انبار سے کھیلتا ہے؟ — جو حریر اور شرع کے ملبوسات سے مزین رہتا ہے؟ — یا یہ حکومت کے کسی اس "محافظِ اعلیٰ" کی روشن اختر کیوں نہیں ہے جس کے دبدبے سے محبانِ وطن کا بھی پتا پانی ہوتا ہے؟ جس کی سواری روز ہزاروں سلامیاں لیتی ہے؟ جس کے قلم میں دادخواہوں کی قسمت ناچتی رہتی ہے؟ — جو افسر کہلاتا ہے — جو عہدہ دار کہا جاتا ہے — یا یہ کسی اس "نائب رسول" کی بچیا کیوں نہیں ہے جو دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں بیس گھنٹے "نظامِ معنوی" کی مالا جپتا رہتا ہے؟ — جو زمہریری راتوں میں بھی اٹھ کر بانگِ سحر بلند کرتا ہے؟ — جس کے طاقوں کی زینت قرآن، حدیث کے بعد صرف "شری کوک شاستر" سے ہو سکتی ہے؟ — یا یہ کسی اس سانڈ کی تخلیق کیوں نہیں جس کی مخلوق، ہاں ہاں بے زبان گونگی مخلوق چار دیواریوں میں بند رہا کرتی ہے؟ جس کے پندارِ غلط انداز کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اس کی مخلوق نگاہوں سے مسکرانا تو درکنار لبوں سے بھی نہیں مسکرا سکتی؟ — یا یہ کسی اس "شریف" کی کنیز کیوں نہیں ہے جس کا گھر مچھلی بازار میں ہوتا ہے! جہاں صبح ہوتے ہی اپنے ہی بچوں، اپنے ہی بیٹوں کو "نکٹا"، "بگتی"، "بے ایمان"، "حرام خور" سے خطاب کیا جاتا ہے جہاں بھائی بھائی کا گلا کاٹتے ہیں، جہاں باپ بیٹے کو مسلتا ہے، جہاں بیٹا باپ کو تہ تیغ کرتا ہے، جہاں زندگی! حیران ہوتی ہے، جہاں سانس لینا دو بھر ہوتا ہے — یہ تمام الزامات اس لڑکی پر عائد

تھے اور یہی اس کے اچھوت ہونیکی وجوہ تھے ——— اور میرے پتاجی ——— ہاں بھائی، پیارے پتاجی کے نزدیک یہ اس لئے میری شریک حیات نہیں ہوسکتی تھی ——— میری باقی زندگی کی کھوتا نہیں ہوسکتی تھی ——— میں نے اپنے باپ سے مشورہ طلب کیا تھا اور اسی لڑکی کیساتھ یکجا ہونے کی اجازت مانگی تھی ——— مگر میرے باپ نے میرے پاس فرمان بھیجا تھا کہ اگر میں اس لڑکی کیساتھ شادی کروں گا تو "والدین کا آخری سلام" ——— انھیں مجھ سے کوئی مطلب نہ ہوگا ——— میرے باپ نے مجھے یہ بھی لکھا تھا کہ انھوں نے میرے لئے ایک بڑی نوکری طے کی ہے، غلامی کا ایک عظیم طوق میرے لئے خریدا ہے اور سرکار آباد ——— ہاں بھائی ولایت ——— زہرا! انگلستان بھی ——— کے لئے اسکالرشپ ——— وظیفہ دلایا ہے ——— اور اگر میں نے یہ شادی کرلی تو سب خاک میں ملجائیگا ——— اُن کی پوزیشن خاک میں ملجائیگی ——— ان کے اعزا چھوٹیں گے ——— وہ کہیں منہ دکھانیکے قابل نہ رہیں گے اور میرا ——— ہاں میرا استقبل بھی ہمیشہ کے لئے تاریک ہوجائے گا۔ ——— صرف اس لئے کیونکہ میں محبت کی دیوی کے سامنے سرِ نیاز جھکا رہا ہوں میں ——— میں اُس سے تعلقات قائم کررہا ہوں جو انسانوں میں سے ہوکر بھی انسان کہلانے کے مستحق نہیں ———

میری شریکِ روح! تو وہاں بیٹھی اپنی آنکھوں کے چمن سے جوہی اور موتیا کی کیوں بارش کررہی ہے! مجھے اب پھولوں کی سیج کی ضرورت نہیں ہے، آؤ ——— آؤ میرے قریب آؤ ——— میرے نزدیک آکر بیٹھو ——— میں تم سے جھوٹ نہیں کرتا ——— میں نے دیوی بناکر تمہاری ہمیشہ پوجا کی اور دیوی ہی بنکر تم سے مجھے الوداع کہو ——— آؤ ——— آؤ اور اگر یہ آقائی اور مولائی دونی

میرے باپ ہیں تو ان سے پوچھو کہ یہ یہاں کیوں تشریف لائے ——— میں نے تو انہیں لکھدیا تھا کہ مجھے ان کی پوزیشن ان کے مذہب اور ان کے خاندان سے دور رہکر ہی اطمینان حاصل ہوسکتا ہے ——— یہ یہاں کیوں تشریف لائے اور ——— اور ان سے یہ بھی دریافت کرو کہ عالیجاہ! شرافت کی تعریف کیا ہے! شریف کہلانے کا کون مستحق ہے! مجھ میں کونسی ذلالت آپ نے دیکھی کہ مجھے کمین سمجھا میں آپ کی شرع کے خلاف کس جرم کی مرتکب ہوئی ہوں؟ اگر باعصمت ہونا ایک حریف کے لئے ضروری ہی ہے تو آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں باعصمت نہیں ہوں؟ اگر حیا اور شرم شرافت کا طرۂ امتیاز ہے تو کیسے معلوم ہوا کہ میرے دیدہ کا پانی مرگیا ہے؛ مجھ میں کیا خرابی ہے کہ میں آپ کے صاحبزادے کی شریکِ حیات نہیں بن سکتی؟ میں آپ کے خاندان کی لڑکیوں سے کم تعلیم نہیں پائی ہے؟ میں آپ کے خاندان کی دوشیزاؤں سے کم خانہ داری سے واقف ہوں؟ میں نے استری دھرم کا آپ کے یہاں کی بیگمات سے کم پالن نہیں کیا ہے؟ مجھ پر آپ کو کیوں اعتبار نہیں ہے؟ کیا میں انسان نہیں ہوں؟ پھر آپ انسان انسان میں تمیز کیوں کرتے ہیں؟ میری ماں نرس ہے تو کیا ہم ذلیل ہوگئے؟ جس طرح آپ ایک عہدے دار بنکر روٹیاں حاصل کرتے ہیں اُسی طرح میری ماں بھی خدمتِ خلق کرکے ہی اپنے گذارہ کا سامان کرتی ہے ——— ہوں کہ میری ماں کی پچھلی زندگی سوسائٹی کے نزدیک متنازعہ ہے لیکن کیا وہ مسلمان نہیں ہوئی؟ کیا اُس نے نکاح نہیں کیا؟ کیا میں اُس کی جائز اولاد نہیں ہوں؟ کیا نائب کو مساوی درجہ حاصل نہیں ہے؟ کیا نومسلم اور دائمی مسلم میں مذہب کے نزدیک امتیاز ہوسکتا ہے؟ میں آخر آپ کے

[illegible] کیا میری نسائیت میں کچھ کمی ہے؟ کیا [illegible] ہتھیاروں سے مسلح نہیں ہوں؟ کیا میں آپ کے [illegible] کی دوشیزاؤں کے مقابلہ میں محبت کا کم جذبہ رکھتی ہوں؟ ...

کاما! میری شریک روح! تو کیوں چپ ہے؟ اگر واقعی یہ میرا باپ ہے تو اس سے کیوں نہیں دریافت کرتی ——— آہ! اچھا ——— زیادہ نہیں صرف یہی پوچھ لے کہ محبت کی تعمیر کیا تعینات کی بنیاد پر ہو سکتی ہے؟

——— کچھ نہیں پوچھنا چاہتی میری دیوی ——— تو اسے یہی بتائے کہ محبت کے مذہب میں انسان انسان میں تمیز نہیں ہوتی، نسلی شرافت محبت کے نظام کے تحت بے معنی چیز ہے، ذاتی شرافت صرف قابل قبول ہو سکتی ہے ——— خون کا اثر ہاں ——— خون کا اثر رہتا ہے لیکن ——— لیکن کیا تعلیم اس اثر پر اثر نہیں ڈال سکتی ——— اور اگر کسی اثر کو زائل نہیں کر سکتی تو تعلیم کا فائدہ؟ ——— آہ! خواب ——— یہ سب خواب ہے ———

یہاں تو کوئی نہیں ہے یہاں میرا کوئی باپ نہیں ہے ——— یہاں میری کوئی دیوی نہیں ہے ——— مگر اس دنیا میں انسان انسان میں تمیز کی جاتی ہے، نسلی شرافت پر فخر کیا جاتا ہے ———

مگر اس لڑکی سے میرا اشتراک میرے مستقبل کے لئے کس طرح مہلک ہو سکتا تھا؟ ——— اعتراض اعتراض کر دیتے ——— سماجی دنیا ٹھوکتی ——— لوگ انگلیاں اٹھاتے ——— مگر ایسے خود غرض گروہ ——— ایسی طوطا چشم سوسائٹی سے خود ہی تعلق کیوں کیا جائے؟ ——— اس بیہودہ فضا میں زندگی ہی کیوں بسر کی جاتی؟

——— اچھا بتاؤ اگر یوں نہ ہوتا ——— آہ! یہ سب [illegible] ——— یہ فساد پر کے لئے تم سب کہاں چلے گئے تھے؟

——— نہیں تم بھی چلی گئی تھیں؟ اور اب یہ کسے لے کر آگئیں؟ ——— یہ میری ماں ہیں ——— ماتاجی! ——— آخر آپ کی ممتا آپ کو یہاں کھینچ لائی؟ ——— آپ کیوں ناراض ہو گئیں تھیں؟ ——— آپ تو عورت نہیں دیوی ہیں کیا آپ کو بھی عورت ——— عورت میں امتیاز گوارا ہے؟ ——— اچھا! میں سمجھا پتاجی کا حکم تھا ——— میری پیاری ماتاجی! ——— اگر آپ کی لڑکیاں کسی اچھوت سے محبت کرنے لگیں تو کیا آپ انکو یکجا ہونے سے روک دیں گی؟ ——— محبت پر بھی حکم امتناعی نافذ ہو سکتا ہے بھلا؟ پھر ——— آپ انہیں زہر دیدیں گی؟ ———

ہا ہا ہا ——— اے ان لوگوں کے خدا ——— دیکھ! اور سن! ——— یہی تیرا نظام ہے؟ یہی تیری حکومت ہے؟ یہی تیرے دین فطرت پر عملدرآمد ہوتا ہے؟ ——— ہاہاہا ———

——— "عفیفہ" پیاری عفیفہ" تم کیسے آگئیں؟ تمہیں کون لایا؟

——— سچ ہے ——— محبت کھینچ لائی؟ ——— مگر تمہیں معلوم ہے کہ ہماری اس محبت کا کسقدر مضحکہ اڑایا جاتا ہے ——— تمہارے بھیا کے پتاجی فرماتے تھے کہ تم میرے لئے سسکیاں بھرتی ہو ——— مگر سسکیاں تو میں بھی تمہارے لئے بھرتا ہوں ——— میں ان سے کہتا ہوں کہ تم حقیقی بہن سے بھی زیادہ مجھے عزیز ہو اور میں حقیقی بھائی سے بھی زیادہ تمہیں پیارا ہوں ——— تو وہ ہنستے ہیں ——— یہ دنیا والے ہنستے ہیں ——— یہ جس طرح خود فریب کے پتلے ہیں اسی طرح ہر شخص انہیں فریب میں آلودہ نظر آتا ہے ——— یہ ثبوت میں میرے دو جزر حیات کی چند کروٹیں پیش کرتے ہیں ——— مگر ان کو ان پریشان کن اطلاعات حادثات اور ان خواہ نخواہ کی پیدا شدہ غلط فہمیوں کا کیا علم ہے جن کی وجہ سے ہم عقل اور سمجھ کی بلندی سے نیچے آگرے تھے ——— نہیں نہیں تم رؤو نہیں ——— میں تمہارا بھائی ہوں ——— اور

تمہارا بھائی رہونگا — میری زندگی میں تمہارے ساتھ سارداا یکٹ کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی — اور میں کبھی نہیں مرونگا میری یہ زہر افشانی ہمیشہ جاری رہیگی — اور تم یہ اپنے پیچھے پیچھے کسے لائیں؟ — میری تارا دیوی ہے — میری ملکہ زینب بی بی مرحومہ کی سہیلی! — تمہاری بہن — اچھا! — شکریہ! آگئیں آپ؟ — ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی میں نے آپ کو دیکھا تھا — اچھا؟ — سچ؟ — خیر! — ہاں پیار — پیار — آپ کا حق ہے — یہ دنیا کے چند روزہ ٹھیکیدار ہمارے اس حق کو نہیں روک سکتے — پھر ان دہرمیوں کو ہم ادہرمیوں کا مطلب — ہاں میں خود سمجھتا ہوں — پاک محبت کے لئے — شدہ پریم کے لئے — بندھن — نکاح — کسی قانون — کی ضرورت نہیں — ہرگز ضرورت نہیں — محبت کی تکمیل کے لئے یکجا ہونا بھی ضروری نہیں — میں شادی نہیں کرونگا — نہ آپ کریں — ہنستی ہوئی سماج ہماری اس ستیہ گرہ پر کب تک خوش رہ سکیگی؟ — ہمارے جذبات کی دبی ہوئی آگ کبھی تو اسے بھسم کرنے کے لئے بھڑکیگی؟ — ہاں ہاں مجھے اپنا وعدہ یاد ہے — اسی وقت — تکمیل اسی وقت ہوگی اور آپ بھی ہمراہ ہونگی — آؤ میرے آہن پوش ساتھیو آؤ — ویرو! کہاں ہو تم؟ — آجاؤ — میری دیوی کا حکم ہے — بھارت ماتا کی تیرہ دل بیٹی کا حکم ہے — زمین کا تارا حکم دیتا ہے — آؤ — غلامی — اس غلامی کی زنجیریں توڑ دو — ظلم و استبداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دو — تمام رسوم، سارے رواج کی بیخ کنی کردو — انقلاب — انقلاب عظیم پیدا کردو — اپنی موجودہ تہذیب کو الٹ دو — اپنی معاشرت کو بدل دو — اپنے علم و ادب اپنی زندگی کے ہر رخ کو بدل دو — میری دیوی کی رہنمائی میں اپنی روح کی ذہنیات میں انقلاب پیدا کردو، بیدار ہو — جاگو — خوابِ خرگوش کے متوالو اٹھو — اپنا مذہب بدل دو — ایک دینِ نو کی بنیاد ڈالو جسکے ذریعہ حقیقی مساوات حاصل ہو سکے — انسان کا انسان سے فرق کرنا مٹ جائے — انسان انسان کو ذلیل کرنا چھوڑ دے —

آبائی جاہ و مرتبت، عہدہ دولت کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں پر جان دینا چھوڑ دے — اور پھر نئی روشنی کے سہارے — نئے نظریات — نئے معتقدات — نئے مسلمات — اور نئے ذہن و خیال کے نئے انقلاب سے کام لیکر موجودہ ارضِ ہندوستان کو الٹ دو — اس غلام آسمان کو الٹ دو — سرمایہ داروں کے ان فلک پیما محلات کو ڈھا دو جنکی تعمیر میں فاقہ کش مزدوروں کی ہڈیاں ہیں — زمینداروں کی ان ریاستوں کو پھونک دو جنمیں بھوکے کسانوں کی سرد آہوں کی کھیتی لہلہاتی ہے — اس قصرِ ظلم پر اپنا پرچم لہراؤ جہاں تمہاری مستقل غلامی کیلئے منصوبے ہوتے ہیں — جبر و استبداد کی گھٹائیں اٹھتی ہیں اور تمہارے خرمنِ ہوش پر برق گراتی ہیں — وہ دیکھو — وہ انقلاب کا سرخ بادل پیچ و تاب کیساتھ اٹھ رہا ہے — تم چھا جاؤ سپاہیو — گولیوں کی بوچھار ہوگی — تم کود پڑو سپاہیو — تلوار کی باڑ چلیگی — تم اپنے سروں کا چراغاں بناؤ — توپیں چلیں گی — تم اپنے سینے سامنے کردو — پھانسی کے تختے تمہیں لبیک کہیں گے — تم بیدھڑک جاؤ — استبداد کے انگارے دہکیں گے — تم راکھ ہو جاؤ — یتیموں کی چیخیں بلند ہونگی — آنے والی نسلوں کا خیال کرو — بیواؤں کے بین سے دل شق ہونگے — مستقبل کی ماؤں کیلئے فضا بناؤ — نوجوانو! — فسانہ نگار کے پرستارو — اپنے پری محلوں سے نکل آؤ — ریشم کے ان کرتوں کو اتار پھینکو — خون سے نہا جاؤ — دیویو — اپنی خلوتوں سے باہر آجاؤ — چوڑیوں کو توڑ ڈالو — کیسری رنگ زیب تن کرلو — آہ! آہ! — فسانہ نگار مر رہا ہے — آخر مر رہا ہے — غلام زمین میں پیدا ہونے کیلئے مر رہا ہے — کوئی نہیں ہے — اسکی داستان سننے کیلئے کوئی نہیں — آہ! اف تارا — دیوی — تم بھی نہیں ہو — اور میری بہن — پیاری بہن — تمہیں بھی روک لیا گیا — سراب! — دہوکا — پریم دہوکا — پریت دہوکا — دنیا کی ہر ریت دہوکا

— زینب — جانِ — روحی! — میں آیا — تمہارے ہی پاس آ رہا تھا — طلسماتِ حیات کی بندشوں کو توڑتا — زلفوں کی گرہوں سے الجھتا ہوا — ناگنوں کے زہر اگلتا — سماج کے تیروں سے چھلنی — ہاں — ہاں — اف — ہندوستان! — محبت کی دیوی!

فرید جعفری

خمارِ خودداری

یہ بادل یہ سناٹا یہ برکھارت یہ رات
جوبن اور امنگوں جوانی ڈھونڈوں کس کا ساتھ
رات انوکھی دُکھن اندھیارا متوالی ہر بات
بجلی چمکے بادل گرجے مور پکاریں سات
سینے میں دریا سا اُمڈے جھومیں ڈالی پات
ہر کوئی ہے ساتھ کسی کے اور میں اپنے ساتھ
یہ بادل یہ سناٹا یہ برکھارت یہ رات

میکش اکبرآبادی

دریادلی

شاہ زمن غازی الدین حیدر بہادر نے انتقال کیا۔ ابھی جنازہ موتی محل سے اُٹھنے نہ پایا تھا کہ ریذیڈنٹ بہادر نے بہ اتفاق رائے اراکین علا
جناب بیگم صاحبہ صاحبِ عالم ابو النصر قطب الدین سلیمان جاہ سلطان عادل حضرت شاہ زماں نصیر الدین حیدر بادشاہ غازی سے عرض کیا کہ آ
خلد مکاں کے بوچے پر سوار ہو کر فرح بخش میں تشریف لائیں تخت شاہی پر متمکن ہوں صاحب عالم چیخ مار کر رونے لگے۔ تمام حضار نے گذارش
حضور ہمیشہ سے یوں ہی ہوتا آیا ہے بوچہ پر سوار ہو کر بارہ دری سے در دولت پر تشریف لائے۔ صاحب ریذیڈنٹ بہادر جیتی با ر
ہوتے ہوئے انگریزی پلٹن انتظام کے لئے لے کر کوٹھی فرح بخش پر حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے حسب دستور خیمہ سبز میں پہلے دو رکعت نماز ادا ک
پھر عبائے خاص بر دوش کر کے تخت شاہی پر متمکن ہوئے صاحب ریذیڈنٹ بہادر اور مجتہد العصر نے تاج فرق مبارک پر رکھا ۱۲ربیع الاو
۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء کو حضور مسند نشین ہوئے ایک شخص نے قبلہ رو کھڑے ہو کر اذان دی۔ اقربائے بادشاہ ارکان دولت نے نذرا
پیش کیں۔ توپیں سلامی کی چلیں ارباب نشاط نے مبارکباد گانا شروع کی تیسرے روز معتمد الدولہ مختار الملک نواب سید محمد خان بہاد
ضیغم جنگ معروف آغا میر افتخار الدولہ مہاراجہ میوہ رام کو خلعت بحالی مرحمت ہوا۔ ممالک محروسہ میں فرمان شاہی جاری ہوا۔ کئی روز تک جشن شا
برپا رہا۔ جلوس کی تاریخیں۔ تہنیت کے قصیدے پیش ہوئے تاریخ جلوس ؎

بہ بست و ہفتم ماہ ربیع الاول و شنبہ — نصیر الدین حیدر شاہ والا شہ سر آ
جہاں از جوش شادی فرخناک طرب آگیں — بگفت از خازن دولت در گنجینہا بکشا
غرض روز جلوس میمنت مانوس و بعد از ہم — قرص سیم بند بخشید و پوشاند خلعتہا
بتاریخ جلوس قطعہائے نذر موزوں شد — کہ خواہد بود بر نوک زبان و یاد اکثرہا
ولیکن از سر الہام واثق گفت تاریخش
نصیر الدین حیدر داد زیب اورنگ ملکی را

بہت سے سکے نظم ہوئے لیکن یہ ایک سکہ پسند والا ہوا اور وہی ضرب میں آیا۔

بہ دہر سکۂ شاہی زدہ ز لطفِ الٰہ
پہر مرتبہ شاہ زماں سلیمان جاہ

[illegible] جلوس شاہانہ سے درگاہ حضرتِ عباسؑ تک واسطے سلام کے سواری حضور کی چوک سے ہو کر گئی۔ [illegible] اشرفی اور روپیہ لٹایا گیا۔ درگاہ میں حاضری کا دسترخوان نہایت تکلف اور شان سے ہوا۔ حضور نے انگریزی طرز کا [illegible] زیب جسم کیا۔ سر پر صندلی تاج مع کلغی۔ سیاہ اچکن اطلس پر شاہی عبا اور پتلون۔ پاؤں میں بوٹ۔ دُبلے پتلے چھریرہ بدن [illegible] جسم۔ غصہ ور۔ عنفوانِ شباب۔ پچیس برس کا سن۔ ابتدا میں انتظام بہت اچھا رفتہ رفتہ عیش و عشرت میں مصروف ہوئے۔ نواب معتمد الدولہ موقوف کئے گئے۔ بلکہ مقید ہو کر خارج البلد ہوئے۔ نواب معتمد الدولہ کی طرح بہو مرتا ال عرف بیگی کو قید سخت کا حکم دے کر راجہ درشن سنگھ غالب جنگ کے حوالہ کیا۔ آخر بہ لطائف الحیل محافظوں کو ذرا کنیز نے کر شب کو اپنے نہر حاگ آئے اور تلوار سے اپنا گلا کاٹ کر جان دے دی۔ اس کی تاریخ کسی نے لکھی ہے ؎

ہاتف زغیب گفت کہ شاباش مرت لال
ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

سہ پہر کو چمن بندی محل اور فواروں کی ہوتی تھی۔ سو طائفہ شہر کا چیدہ اور سو دیہات کا ملازم سرکار تھا۔ یہ سب حاضر ہوتے تھے پچیس پچیس [25] [25] طائفہ ایک ایک رنگ کے جوڑے پہنے ہوئے۔ اور بجان متی چوسے والیاں۔ ڈومنیاں۔ قوال بین کار۔ باجے۔ سرودیے۔ ریچھ والے قلندر۔ بکری۔ اور بندر سلے ہوئے حاضر کرے میں تمام سامان عیش موجود تھا۔ انگریزی میز پر بادہ ارغوانی کے کنٹر۔ گزک کا سامان۔ تشتریوں میں پستے اور بادام رکھے ہوئے۔ دوسری طرف پلاؤ۔ دو پیازہ عمدہ عمدہ پکوان مربے۔ اچار۔ ادہر خود بدولت تشریف لائے۔ اُدہر انگریزی باجے بجنے لگے۔ طائفے ناچنے لگے۔ خود بدولت اکل و شرب میں مصروف ہوئے۔ ایک ایک دن میں پانچ پانچ سو جوڑے اور جواہر نگار کپڑے تقسیم کر دیئے۔ نواب ملکہ زمانیہ کا بہت اچھا زمانہ تھا۔ ایک روز محل میں تشریف فرما ہوئے۔ ایک رقعہ ہاتھ میں تھا۔ ملکہ نے پوچھا مرزا ہاتھ میں کیا ہے۔ فرمایا پچاسی لاکھ روپیہ فیض آباد سے آیا ہے۔ یہ کہکر اُن کی طرف پھینکدیا قدسیہ محل کے واسطے جاڑوں میں ۱۰ لاکھ روپیہ کی دو رزائیاں بنا کرتی تھیں۔ گرمیوں میں ملازموں کو تقسیم ہو جایا کرتی تھیں۔ دھنیا مہری اور ڈتو کہاری کا بڑا عروج تھا۔ کہنے کو کہاریاں تھیں۔ لیکن دہوم دھڑکے سے اُن کی سواریاں نکلتی تھیں۔ دھنیا مہری نے پل اور مسجد۔ کنویں بنوائے۔ دھنیا مہری کا پل اب تک نہایت استحکام سے بنا ہوا لکھنؤ میں موجود ہے۔ مکا درزی مشہور خیاط تھا۔ کسی شہر سے ایک سوداگر نہایت نفیس عطر لایا مہینوں اس اُمید پر پڑا رہا کہ شاہی دربار میں رسائی ہو۔ قسمت نے یاوری نہ کی ایک روز مکا درزی سے سلطنت کی کچھ شکایت کی اور کہا تمہارے شہر سے نااُمید جاتے ہیں۔ مکا درزی نے سب عطر منگوا کر دیکھا۔ قیمت پوچھی۔ کہا سب مال پچاس ہزار کا ہے۔ ناک بھوں چڑہا کر بولا۔ یہ عطر [illegible] بادشاہ کے واسطے۔ اس سے اچھا تو اُن کے گھوڑوں کے اصطبل میں پڑتا ہے کہ پیشاب اور لید کی بو نہ آئے۔ جا میرے اصطبل میں چھڑک دو [illegible] کی تمام پوشاک مکا کے ہاتھوں تیار ہوتی تھی ہزار روپیہ روز گرمی کی پوشاک کے لگتے تھے اور نئی پوشاک بدل جاتی تھی۔ دوسرے روز تقسیم ہو جاتی تھی۔ [illegible] کے عہد میں [illegible] عمارتیں جو اب لکھنؤ میں مکا باغ۔ سکندر باغ [illegible] مشہور ہیں۔ بادشاہ کا بڑا محل نواب ملکہ زمانیہ



وداع بہار

جو عالی حوصلہ اور سیر چشم تھیں۔ دوسرا محل ممدرہ علیا۔ تیسرا محل نواب خورشید محل محبوب ترین تھا۔ ایک دن نواب نے از راہ نوازش اپنا تاج شاہی ان کے سر پر رکھ دیا۔ اس دن سے تاج محل مشہور ہوا۔ چوتھا محل نواب بادشاہ محل۔ پانچواں محل۔ نور محل چھٹا محل نواب صاحبہ۔ چھاپہ خانہ و پتھر کا ولایت سے منگوایا۔ حجام انگریز ملازم رکھا گیا۔ ایک محتاج خانہ تعمیر کیا گیا جس میں اندھے۔ لنگڑے۔ اپاہج عورت و مرد رکھے گئے۔ ہزاروں روپیہ کا خزانہ ریذیڈنٹ بہادر کے ذریعہ سے منظور ہوا۔ انگریزی تعلیم کا اسکول قائم ہوا۔ موتی محل میں رصد خانہ سلطانی بنوایا گیا۔ شفا خانہ یونانی و انگریزی قائم ہوا۔ گنگا سے نہر کان پور تک بنوائی گئی۔ شاہی شجاعت مشہور عالم تھی۔ ایک مرتبہ فیل خانے سے سفید ہاتھی مست ہو کر شہر میں نکل آیا۔ لوگوں کا بہت نقصان ہوا بادشاہ کو خبر ہوئی۔ بوچہ پر سوار ہو کر چوک میں آئے۔ ہاتھی کو دیکھ کر آواز دی وہ سر جھکا کر سامنے آیا۔ ارشاد ہوا بھوکا ہے۔ اسے دودھ جلیبی کھلا دو جب خوب سیر ہو کر کھا چکا۔ بادشاہ خود اُس پر سوار ہو کر فیل خانہ میں آئے اور ہاتھی بند ہوا دیا گیا۔ چھتر منزل کے قریب ایک امام باڑہ بنوایا۔ اس میں ناکتخدا لڑکیاں۔ سیدانیاں۔ اچھوتیوں کے نام سے رکھی گئیں اور بیش بہا تنخواہیں مقرر ہوئیں۔ نفیس پوشاک زیور مطلا مرصع کار عطا ہوا مگر اُن کو غیر مرد سے بات کرنے کا حکم نہ تھا۔ اگر کوئی بات خلاف حکم صادر ہوتی فوراً دیوار میں چنوا کر تیسرا انداز کی جاتی تھیں۔ لالہ رام پرشاد رفیق مہاراجہ افتخار الدولہ نے کئی حسین عورتیں بادشاہ کے حضور میں پیش کیں۔ وہ داخل محل شاہی ہوئیں اور خطاب بیش محل عطا ہوا۔ شہر کی نامی طوائف کرم بخش داخل محل ہوئی۔ فیض النسا مغلانی حسین طرحدار محل میں داخل ہو گئی۔ نواب معتمد الدولہ بہادر وزیر جب معزول ہوئے۔ ان کے قائم مقام میر فضل علی خاں نائب مقرر ہوئے۔ خطاب اعتماد الدولہ بہادر عطا ہوا۔ ظفر الدولہ کپتان فتح علی خاں کے بیٹے کو خطاب اقبال الدولہ اور خلعت جرنیلی فوج کا عطا ہوا۔ منشی غلام مرتضیٰ روضہ خواں جنت آرامگاہ کے مقبرے میں دس روپے ماہوار قرآن خانی کا پاتے تھے۔ آدمی تھے ظریف الطبع آداب مصاحبت سے واقف تھے۔ اقبال الدولہ کے دربار میں داخل ہوئے چند روز ملازمت پر رستم نگر میں عمارت عالیشان بنوائی۔ بعد انتقال نواب اعتماد الدولہ نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں وزیر مقرر ہوئے یہ وزیر بہت عقلمند تھے۔ اپنی تدبیر سالم سے منّن محمد بخش خواص کو دربار شاہی سے نکلوا دیا۔ نصیر الدین حیدر بہادر کا زمانہ بھی عالیشان فیاضیوں سے بھرا ہوا ہے۔ دس برس حکومت کر کے پینتیس برس کی عمر میں چوتھی ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء دفعتاً انتقال فرمایا۔ اپنی نو تعمیر کربلا میں جو دریائے گومتی کے قریب ہے دفن ہوئے۔ قبر پر ایک قطعہ تاریخ کندہ ہے اور ایک لوہے کا حضیرہ بھی ہے۔

عشرت لکھنوی

رباعی

راتیں ہوئیں وقف آہ کرنے کے لئے ترسا ہی کئے گناہ کرنے کے لئے
کچھ اور تھا فطرت کا تقاضا لیکن دنیا بھی پڑا نباہ کرنے کے لئے

مر گیا ہوتا

رشک اُس کو اگر ملا ہوتا قیس دو دن میں مر گیا ہوتا
بزمِ دشمن میں کیوں ذلیل ہوا میں نہ جاتا اگر تو کیا ہوتا
پہلے مائل ہوئے تھے آپ میں اتنا انصاف تو کیا ہوتا
رنج بیحد سہے نہیں جاتے مجھے یارب اُٹھا لیا ہوتا
ایک جاتا تو دوسرا رہتا ایک دل اور بھی دیا ہوتا
خلق میں تیری کیا کمی ہوتی مجھے پیدا نہ گر کیا ہوتا
غم اُٹھانے کو گر بنایا تھا تو مجھے اپنا غم دیا ہوتا
اُسے ظالم اگر کیا پیدا تو مجھے بے وفا کیا ہوتا
دیکھنا شوق میں یہ کہتا ہوں مجھے دشمن بنا دیا ہوتا
غم سے پھر زہر تلخ ہوتا کم کر کے بند آنکھ پی لیا ہوتا
وہ کسی سے نہ آشنا ہوگا مجھ سے ہوتا جو آشنا ہوتا
مجھ سی الفت ہی غیر سی نہوٹ عشق ہوتا اگر تو کیا ہوتا
بزمِ دشمن میں تجھ سی بات نہ کی اُسے کمبخت مر گیا ہوتا
رنج ہوتا اگر نہ تھم تھم کر عشق تو ہوتا بے مزہ ہوتا

اُن پہ عاشق کیا خطا کیا تھی
مجھ سے اتنا تو کہہ دیا ہوتا

عاشق ٹونکی

بدنصیب

گینارڈ نے جب اپنی محبوبہ سے شادی کرلی تو دونوں کی دلی آرزو تھی کہ ہمارے ہاں لڑکا پیدا ہو اور یہ ہستی جس کی اسقدر آرزو کیجا رہی تھی اپنے ماں باپ کی خوشی پوری کرنے کے لئے قبل از وقت اس دُنیا میں آگئی۔ ماں جاپے میں مرگئی اور باپ اس صدمہ کو برداشت نہ کرسکا اور پھانسی لگا کر مرگیا

کانسٹنٹ گینارڈ کا بچپن لائق تقلید تھا مگر وہ بدنصیب تھا اسکول میں اُسے اکثر سزا ملتی تھی گو وہ اس کا مستحق نہیں ہوتا تھا اور بطور جرمانہ اُسے زیادہ کام کرنے کیلئے دیا جاتا تھا اور لڑکوں کی جو مار پڑنے والی ہوتی تھی غلطی سے اُس پر پڑ جاتی تھی اور امتحان کے زمانے میں بیمار ہو جاتا تھا جب اُس نے اپنے اسکول کی تعلیم ختم کی تو کُند ذہن اور بدمعاش مشہور ہو چکا تھا۔

بی۔ اے کے امتحان میں اپنے برابر والے لڑکے کو لاطینی زبان میں ترجمہ کرکے دیا۔ وہ لڑکا کامیاب ہوگیا اور اسے نکال دیا گیا یہ کہہ کر کہ تم نے نقل کی ہے۔

زندگی کے ایسے ناسازگار واقعات کسی اور شخص کو تو چڑچڑا اور بدل کر دیتے مگر کانسٹنٹ گینارڈ وسیع القلب آدمی تھا۔ اسے یقین تھا کہ سرت نتیجہ ہے نیکی کا اس لئے اُس نے تہیہ کرلیا کہ اپنی بدنصیبی کو شجاعت ہی سے دور کروں گا۔

جس دوکان پر وہ ملازم تھا ایک دن اُس میں آگ لگ گئی جب اُس نے اپنے آقا کے چہرے پر غمناک جذبات دیکھے تو اس سے نہ رہا گیا اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس گیا تاکہ تجوری میں جو قیمتی چیزیں تھیں کم از کم انہیں تو نکال لائے اُس کے سارے بال جھلس گئے اور ہاتھ اور بازو بُری طرح جل گئے مگر اُس نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر تجوری کو توڑ ہی لیا اور قیمتی چیزیں اسمیں سے نکال لیں۔

یکایک اُسے معلوم ہوا کہ اُسے کوئی گھسیٹ کر باہر لے جا رہا ہے۔ دو سپاہی اس کا گلا پکڑ کر گھسیٹ رہے تھے۔

ایک مہینے بعد اُسے پانچ سال کی سزا کا حکم سُنایا گیا اس جُرم میں کہ اس نے تجوری توڑ کر قیمتی چیزوں کو چرانے کی کوشش کی تھی۔

قیدخانے میں سب قیدی بگڑ کھڑے ہوئے اور ایک پہرہ دار پر ٹوٹ پڑے۔ اتفاق سے کانسٹنٹ کا دھکا لگنے سے وہ پہرہ دار گر پڑا اور سرکش قیدیوں نے اُسے مار ڈالا۔

بغیر کچھ تکے سنے کانسٹنٹ گینارڈ کو عمر قیدیوں کے محبس میں ڈال دیا گیا۔ لیکن اس کی معصومیت آڑے آئی اور وہاں سے وہ فرار ہوگیا اور فرضی نام سے پھر اپنے شہر میں پہونچ کر زندگی گزارنے لگا۔ یہ سمجھ کر کہ اس نے قسمت کو شکست دیدی تھی اُس نے پھر نیکی اور

[illegible] شروع کردیا۔

ایک دن ایک میلے میں اُس نے ایک بدکے ہوئے گھوڑے کو دیکھا کہ گاڑی لئے اُلٹا چلا جارہا ہے اور گاڑی خندق میں گرا ہی چاہتی ہے۔ فوراً وہ اپنے آپ کو گھوڑے کے آگے ڈال دیتا ہے، اُس کی کلائیاں چل کھا جاتی ہیں ایک ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے اور ایک پسلی چور چور ہوجاتی ہے مگر گاڑی کو خندق میں گرنے سے بچا لیتا ہے۔ گھوڑا ڈر کر پلٹ جاتا ہے، میلے کی بھیڑ بھاڑ میں گھس جاتا ہے اور ایک بڈھے دو عورتوں اور تین بچوں کو کچل ڈالتا ہے۔ گاڑی میں کوئی بھی نہ تھا

شجاعت کے کارناموں سے متنفر ہو کر کانسٹنٹ گینارڈ اب یہ فیصلہ کرتا ہے کہ آئندہ خاکسارانہ طور پر نیکی اور بھلائی کیا کرونگا۔ چنانچہ لوگوں کے مصائب و آلام دور کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتا ہے۔ لیکن وہ روپیہ جو وہ غریب عورتوں کو دیتا ہے نہایت بیدردی سے اُن کے شوہر شراب خوری میں اُڑا دیتے ہیں۔ وہ گرم کپڑے جو غریب مزدوروں میں تقسیم کرتا ہے بجائے انکے سختیاں برداشت کرنیکے عادی جسم کو محفوظ رکھنے کے اور انکے لئے نمونیہ کا باعث ہوتے ہیں۔ ایک فاقہ زدہ کتے کو ترس کھا کر اُس نے اپنے ہاں رکھ لیا تھا مگر اُس کے کاٹنے سے چھ آدمی پڑوس میں پاگل ہوگئے۔ ایک نوجوان کو مستحق سمجھ کر اُس نے کافی رقم صرف کر کے فوج میں اسے ملازم کرا دیا مگر اُس نے یہ کیا کہ دشمن کے ہاتھ قلعہ کے تمام نقشے بیچ ڈالے۔

کانسٹنٹ گینارڈ نے یہ سوچا کہ روپیہ نیکی سے زیادہ بدی کا سبب ہوتا ہے اس لئے اپنی رعایت کو اِدھر اُدھر ضائع کرنے کی بجائے اُس نے طے کر لیا کہ کسی ایک ہستی کو اس سے مستفیض کرے۔ اِس لئے اُس نے ایک یتیم لڑکی کو گود لے لیا۔ اگرچہ اس میں کوئی حُسن نہیں تھا تاہم بعض خوبیاں اُس میں ضرور تھیں۔

اس یتیم بچی کو اُس نے شل اپنی اولاد کی طرح پال پوس کے پروان چڑھایا۔ افسوس! کانسٹنٹ گینارڈ نے اُس کے ساتھ اتنی بھلائی کی، اُسکا اتنا خیال رکھا، اس قدر مہربانی سے اُس سے پیش آیا کہ ایک شب کو وہ لڑکی اُس کے قدموں پر گر پڑی اور لگی اُس سے اپنی محبت کا اظہار کرنے اُس نے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں نے تو تمھیں اپنی لڑکی سمجھ کر پالا ہے، اپنی بیٹی بنا کر اتنا بڑا کیا ہے، میں تو ہرگز تم سے اس قسم کی محبت نہیں کر سکتا جو میرے لئے بمنزلہ جُرم ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔

وہ اُسے سمجھاتا رہا پدرانہ شفقت سے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ جسے تم محبت سمجھ رہی ہو وہ محبت نہیں ہے بلکہ نفسانی خواہش ہے اور میں جلد از جلد تمہارے لئے مناسب بر تلاش کروں گا۔

دوسرے دن صبح کو اُس نے لڑکی کو اپنی دہلیز پر پڑا پایا ــــــ مُردہ۔

اس واقعہ سے کانسٹنٹ گینارڈ اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے کسی کے ساتھ نیکی کرنے ہی سے توبہ کر لی اور قسم کھائی کہ اب نیکی اسطرح کی جائے گی کہ صرف بدی کو روکا جائے گا۔

خودکشی والے واقعہ کے کچھ عرصے بعد اس کے علم میں اتفاقاً یہ بات آگئی کہ اس کا ایک دوست کوئی سنگین جُرم کرنے والا ہے۔

وہ آسانی سے پولیس میں اطلاع کر کے اُسے گرفتار کرا سکتا تھا لیکن اُس نے اسے ترجیح دی کہ خود ہی جُرم کا ارتکاب نہ ہونے دے اور مجرم کو تباہی بربادی سے بچا لے۔ اس لئے اُس نے جرم کی ساری کڑیاں ملائیں اور اب اس کا انتظار کرنے لگا کہ عین موقع پر مجرم کو شکست دیدے۔ لیکن وہ بدمعاش جس کی پیش بندیاں یہ کر رہا تھا بہت چالاک تھا۔ اُس نے سب کچھ تاڑ لیا اور اس طریقے سے کارروائی کی کہ جرم بھی ہو گیا اور مجرم بھی بچ کر نکل گیا اور کانسٹنٹ گینارڈ گرفتار ہو گیا۔

اس صوبے کے منصف نے کانسٹنٹ گینارڈ کے خلاف جو تقریر کی وہ منطق کے اعتبار سے ایک شاہکار چیز تھی۔ اُس نے مجرم کی ساری زندگی پر ایک نظر ڈالی ــــــ اس کا نفرت انگیز بچپن، اُسے جونسز اُپس ملیں، بی۔ اے۔ کے امتحان سے نکالا جانا، آتش زدگی میں نہایت چالاکی سے چوری کرنا، قیدیوں میں سرکشی کی خوفناک سازش کرنا، حبس سے فرار ہونا، فرضی نام تجویز کر کے اپنے شہر واپس ہو کر زندگی گذارنا . .

اس کے بعد منصف نے فنِ خطابت کا سارا زور صرف کر دیا۔ اُس نے مجرم کو پارسا بننے والا ریاکار، شریف گھرانوں کو برباد کرنے والا، جو اپنے خبیث جذبات کی تسکین کے لئے شوہر کو پیسے دے کر شراب خانے بھجوا دے جھوٹا دکھاوے کا محسن، ذرا ذرا سے انعامات کے پردے میں سیاہ کاری کرنے والا ہیبت ناک درندہ رجائیت کے لباس میں چھپا ہوا۔

اُس نے اِس بدمعاش کی شاطرانہ خونخواری کا نفرت انگیز تجزیہ کیا جو دیوانے کتّوں کو پالتا ہی اس لئے تھا کہ لوگوں کو اُن سے کٹوائے ابلیس جو بدی کو محض اس وجہ سے پسند کرتا تھا کہ وہ بدی ہے۔ بدکے ہوئے گھوڑے کو روکنے کی کوشش میں اپاہج ہو گیا ــــ آخر کیوں؟ صرف اس خوفناک مسرّت کو محسوس کرنے کے لئے کہ بھیڑ میں ایک بدکا ہوا گھوڑا گھس جائے تاکہ بڈھوں، عورتوں اور بچوں کو کچل ڈالے۔

آہ! ایسا درندہ تو خدا جانے کیا کیا کرتا ہوگا۔ اس میں شک و شبہ کا شائبہ تک نہیں تھا کہ اُس نے بے شمار ایسے بھی جرم کئے ہوں گے جن کا علم ہمیں کبھی نہ ہوگا۔ ہزاروں سبب ایسے ہیں جن کی بنا پر یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ اسی کی بدمعاشی تھی کہ دشمنوں کو قلعے کے نقشے پہونچ گئے تھے۔ رہا اس یتیم بچی کا قصّہ جسے اس نے پالا اور پھر ایک دن اسی کے دروازے پر مُردہ پڑی ملی، تو بھلا سوائے اس کے اُسے اور قتل ہی کون کر سکتا تھا؟ یہ یقیناً پیش بندی تھی اُس شرمناک عیاشی و بہیمیت کی جس کا تذکرہ کرنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں ہوتی۔

اتنی غیر متعلق باتیں بیان کرنے کے بعد آخری جُرم کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجرم ڈھٹائی سے ہزار منکر ہو مگر یہاں تو پوری شہادت موجود تھی اور قانون جہاں تک اجازت دے اِسے پوری پوری سزا ملنی چاہئے۔ اس لئے اُسے سزا دی جائے گی از روئے انصاف، اُس پر سختی نہیں کی جائے گی یہ کوئی مجرم نہیں ہے بلکہ یہ تو کوئی بلا ہے۔ ایک ایسی خونخوار بلا ہے بدی اور ریاکاری کی کہ اسے دیکھ کر نیکی سے ہمارا اعتقاد اُٹھ جاتا ہے اور انسانیت کی طرف سے ہم مایوس ہو جاتے ہیں۔

منصف کی رائے سُننے کے بعد کانسٹنٹ گینارڈ کے وکیل کے لئے سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں تھی کہ وہ اپنے موکل کو فاتر العقل قرار دے کر اُس کی جان بچانے کی کوشش کرے۔ وکیل نے اپنی پوری سی کوشش کی ــــــ دماغی خرابیوں کی گتھیاں سلجھائیں۔ مجرموں کے نظامِ عصبی کے درہم برہم ہونے پر نہایت قابلیت سے بحث کی۔ اپنے موکل کو غیر ذمہ دار، فاتر العقل قرار دیا اور ثابت کیا

[illegible] مرض کا علاج قید خانہ میں نہیں بلکہ پاگل خانہ میں ہوتا ہے کانسٹنٹ گینارڈ کو اتفاق رائے سے سزائے موت سنائی گئی۔

پبلک اس کے جرم کی روداد سن کر بھڑک اٹھے تھے موت کا حکم سنتے ہی مارے خوشی کے نعرے لگانے لگے۔

کانسٹنٹ گینارڈ کی موت بھی اس کے بچپن کی طرح لائق تقلید مگر بدنصیب ہوئی۔ پھانسی کے تختے پر وہ بغیر کسی خوف یا بناوٹ کے چڑھ گیا اس کا چہرہ اس کے ضمیر کی طرح مطمئن تھا، جیسے کسی شہید کے چہرے پر سنجیدگی و سکون طاری ہوتا ہے —— مگر دیکھنے والے اس جذبے کو بہیمیت کی بے پروائی سمجھے۔

عین قتل کے وقت یہ معلوم کرکے کہ جلّاد غریب ہے اور کثیر العیال ہے اس نے آہستہ سے جلّاد کے کان میں کہا "میں نے اپنی ساری ملکیت تمہارے نام چھوڑی ہے" جلّاد اس خوش خبری سے ایسا چونکا کہ اپنے محسن کا سر کاٹنے کے لئے بجائے ایک ضرب کے اسے تین ضربیں لگانی پڑیں۔

تین مہینے بعد کانسٹنٹ گینارڈ کا ایک دوست سفر سے واپس آیا تو اس نے اس کا حسرت ناک انجام سنا۔ مرنے والے کی خوبیوں سے صرف یہی دوست واقف تھا۔ قسمت کی ناانصافی کی کسی حد تک تلافی کرنے کی غرض سے اس نے اپنے دوست کی قبر کی ایک مرمریں لوح بنوائی اور اس کا کتبہ لکھکر کندہ کرنے کے لئے دیدیا۔ قسمت میں یہ لکھا تھا کہ اس کا دوست دوسرے ہی دن سیلانِ دم سے مرجائے۔ اجرت چونکہ پیشگی ادا کی جاچکی تھی اس لئے بدنصیب گینارڈ کی قبر پر کتبہ نصب کر دیا گیا۔

اس کاریگر نے جس کے سپرد کندہ کرنے کا کام کیا گیا تھا تحریر کے ایک لفظ کو یہ سمجھا کہ غلط لکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے اس غلطی کو اپنی طرف سے ٹھیک کر دیا۔ اور وہ نیک خصلت انسان جو زندگی میں ہمیشہ غلط کار سمجھا گیا تھا۔ مرنے کے بعد بھی سدا کے لئے اس کی قبر پر یہ کتبہ لگا:۔

"کانسٹنٹ گینارڈ کا مدفن"

(شریر النفس نسان)

کندہ کرنے والے نے "شریف النفس انسان" کو لکھنے والے کی غلطی سمجھ کر "شریر النفس نسان" بنا دیا۔

(بین رچی پن)

شاہد احمد۔ بی۔ اے

رباعی

آساں نہیں مرتبِ دلنوازی ہونا — ممکن نہیں سب کی سرفرازی ہونا
تو حسن کا مشکور نہیں ہو سکتا — محمود کو پیپتا تھا ایازی ہونا

منظر

جوانی کی کہانی — بیوہ کی زبانی

میں وہ عمرِ محبت ہوں جو فرقت میں گزرتی ہے — وہ افسردہ جوانی ہوں جو حسرت میں گزرتی ہے
جو عشرت میں گزر جائے اُس اک دن کی تمنا ہوں — اور اس اک رات کی حسرت جو عشرت میں گزرتی ہے
شبابِ مضطرب پیہم جیسے بدلے وہ کروٹ ہوں — وہ حالت ہوں جو انگڑائی کی حالت میں گزرتی ہے
جوانی کے چمن میں وہ نہالِ نامرادی ہوں — ہر اک رُت پھول پھل آنے کی حسرت میں گزرتی ہے
جوانی اور پھر میری جوانی اک قیامت ہے — کسی کو کیا خبر جو اس قیامت میں گزرتی ہے
جوانی اور یہ بے لذت گنہ، یعنی خیالوں کے — نہ عصمت میں گزرتی ہے نہ لذت میں گزرتی ہے
جوانی کو بچا لوں کیونکر الزامِ تمنا سے — تمنا خود نظر بنکر شہادت میں گزرتی ہے
کسی کا دیکھنا اپنی طرف دیکھا نہیں جاتا — کہوں کیا دل پہ کیا آفت حقیقت میں گزرتی ہے
اندھیری راتیں، برسات کی کالی گھٹائیں، — جوانی کی سہانی رات حسرت میں گزرتی ہے
جوانی کے لئے اکثر دعا کرتی تھی بچپن میں — تمناؤں میں کٹتی ہے محبت میں گزرتی ہے
مگر یہ کیا خبر تھی وہ جوانی آئے گی مجھ پر — کہ جو لعنت میں کٹتی ہے نحوست میں گزرتی ہے
بنا دی ہے مرے دم پر تو اس کافر جوانی نے — خدا جانے کسی کی کس مصیبت میں گزرتی ہے
جو دم بھر کو نہ ٹھہرے وہ زبانِ شکوۂ غم ہوں — وہ لب ہوں جس کو قسمت کی شکایت میں گزرتی ہے
کسی کی جستجو ہو جس کو وہ چشمِ تمنا ہوں — وہ بے چینی ہوں جو دل پر ضرورت میں گزرتی ہے
وہ گھبراہٹ ہوں جیسے کوئی بیتابی نہو باقی — وہ مدت ہوں جو بیکاری کی فرصت میں گزرتی ہے
غرض وہ لاش ہوں دھوکا ہے جس پر زندگانی کا — غرض وہ زندگی ہوں جو مصیبت میں گزرتی ہے

ہنرمند و سلیقہ ور، حسین و عشق پیشہ ہوں
مگر ہندوستان میں ننگِ ہستی ہوں کہ بیوہ ہوں

بسمل سعیدی

انطون چیخوف

حیات انسانی ایک مختصر افسانہ ہے گو تاریخ ایک مسلسل اور غیر مختتم کہانی تصور کی جاتی ہے۔ شاید اسی لئے ہر فرد و بشر میں مختلف افسانوں کا فطری شوق پایا جاتا ہے۔ اگر افسانوں اور کہانیوں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وجود تخلیق آدم سے چلا آتا ہے۔ انجیل کے افسانے، ہومر کے نغمے اور مصر کی دفن شدہ یادگاروں کی کہانیاں غالباً قدیم ترین نمونے ہیں۔ بدھ کی پیدائش سے متعلق قصے جو اس زمانے میں بہت مقبول ہوئے ظاہر کرتے ہیں کہ ہندوستان بھی اس فن میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ انہیں کہانیوں کے تتبع میں حکیم لقمان نے کچھ قصے لکھے۔ آہستہ آہستہ یہ فن یونان سے ہوتا ہوا اہلِ روم کے حصے میں آیا۔ جنہوں نے اسے تاریخ میں داخل کر دیا۔ از منہ قدیم میں تاریخ اور قصے میں بہت کم فرق تھا۔ یونانی ہیروڈوٹس اور رومن لوی کی کتب تواریخ اس کی شاہد ہیں۔

یورپ میں افسانہ نگاری کی ابتدا بحیثیت فن اطالیہ کے مشہور ادیب بوکاچیو سے ہوئی جس نے ۱۳۴۸ء کے تاریخی پلیگ کے موقعہ پر کچھ کہانیوں کا مجموعہ لکھا۔ اس میں عربی افسانوں کی مشہور کتاب "الف لیلہ" کا اثر پایا جاتا ہے۔ شیکسپیئر، ہومر اور اسی قسم کے دیگر افسانہ نگاروں کی کتب پر بھی عربی افسانوں کے رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے اس میں کلام نہیں کہ انہوں نے اس فن کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ سب لوگ اسے مغرب نژاد سمجھتے ہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد یہ فن دست بدست فرانس میں آیا، جہاں یہ اپنے اصلی عروج کو پہنچا ہے۔ زولا، فلابیر، وکٹر ہیوگو، اور موپاساں ایسے باکمال مفکروں نے افسانہ نگاری کو حقیقت نگاری کی آخری حد تک پہنچا دیا۔ دراصل موجودہ افسانہ نگاری کا ارتقا اسی زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ فرانس سے یہ فن روس جا پہنچا ہے۔ جہاں اسے انتہائی عروج حاصل ہوا۔ روس کے مصنفین نے ناول نویسی پر مختصر افسانہ نگاری کو ترجیح دی۔ گو ملک کی نسبت اس کی نشاۃ الثانیہ دو صدی بعد شروع ہوئی تاہم اس نے ایسے ادیب اور مصنف پیدا کئے جن پر فکرِ انسانی بجا طور پر نازاں ہے۔

مختصر افسانہ نگاری کے میدان میں جدید طرز کا بانی انطون چیخوف بہت شہرت رکھتا ہے۔ روسی ادب کے تیسرے دور کا یہ سالار کا ایک غریب گھرانے میں ۱۷ جنوری ۱۸۶۰ء کو پیدا ہوا۔ اس نے ۱۸۸۴ء میں طبابت کی سند حاصل کی مگر اس کو اپنا ذریعۂ معاش نہ بنایا۔ ا گو اسے معلوم تھا کہ وہ تصانیف سے زیادہ کما سکتا ہے چنانچہ شروع شروع میں اس نے چند مزاحیہ افسانے لکھے مگر جوں جوں تجربہ بڑھتا گیا [illegible] اور اس نے دنیا کا نہایت متانت سے مطالعہ کیا۔ چیخوف کے افسانوں کے مترجم مسٹر [illegible] نے اپنے مقدمہ



Anton Tchekhov in 1899.



[illegible]

اس کے مضامین وہی ہیں جو وہ اپنے گردوپیش سے مطالعہ کیا کرتا تھا، اس کے کردار بہادرانہ کارناموں کے مظہر نہیں ہوتے بلکہ اُن [illegible] کو وہ روزانہ دیکھتا تھا۔"

چیخوف کے افسانے اُسے دنیائے ادب کی صفِ اوّل میں جگہ دیتے ہیں۔ اس کی شاہراہ دوسرے افسانہ نگاروں سے بالکل علیحدہ تھی۔ اس کا کام فطرتِ انسانی کی عکاسی کرنا تھا ـــــ اُس کا دماغ ایک آئینہ تھا جس میں وہ فطرت کا عکس دیکھ کر اُسے دنیا کے سامنے پیش کر دیتا تھا۔

چیخوف کے زمانے میں رُوس کی اخلاقی حالت بہت پست تھی۔ سیاسی طور پر اُس میں آزادی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا، جب گردوپیش کے یہ حالات ہوں تو چیخوف کے بربطِ فکر سے سوائے المیہ نغموں کے اور کونسی صدا اُٹھ سکتی تھی۔

چیخوف کے مختصر افسانے رُوسی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے کردار روزمرّہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُس کا تخیل شاعرانہ مبالغے سے پاک ہے، اس کے افسانوں میں بیجا طوالت نہیں وہ اپنے افسانوں میں دنیا کا تمام نشیب و فراز بیان کرنے کی بجائے زندگی کی صرف ایک قاش پیش کرتا ہے ـــــ یہی چیخوف کا کمال ہے اور اسی کمال نے اسے زندگی کا بہترین مصوّر بنا دیا۔

ایک رُوسی نقاد چیخوف کے فن کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے "رُوس کے خاموش مناظر کی طرح مغموم و الم انگیز، رُوس کے موسمِ خزاں کی مانند مختلف رنگوں کا مرکب، مشرقی غروبِ آفتاب کا سا نازک و لرزاں، موسمِ گرما کی رات کی طرح پُراسرار و عمیق، نیلگوں آسمان اور کھلے میدان کا گیتا المیہ زندگی و مبہم مسرّت کا ترانہ ـــــ یہ ہے چیخوف کا آرٹ۔"

اور یہ بڑی حد تک درست بھی ہے۔ اس لئے کہ اس کے افسانے عموماً دردانگیز راگ ہوتے ہیں جو اُس نے صفحۂ قرطاس پر پھیلا دیئے ہیں۔ اکثر اوقات اُسے مختصر افسانہ نگاری کے فن کے لحاظ سے فرانسیسی انشا پرداز گے۔ دے۔ ماپساں کا ہم پلّہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ غلطی ہے۔ ان دونوں مفکّروں کے عمیق مطالعے کے بعد یہ امر روشن ہو جاتا ہے، کہ انکے نفسیات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ماپساں کی نظرِ فکر انسان میں حیوانی جذبات دیکھتی ہے اور چیخوف انسانیت کے عمیق ترین گڑھوں میں محبت اور امید تلاش کرتا ہے۔

چیخوف بنی نوعِ انسان کی مشکلات کے متعلق کیا جواب دیتا ہے؟

کیا وہ معلمِ اخلاقیات تھا؟

کیا اُس نے کسی نئے مذہب کی بنا ڈالی؟

آخری دو سوالات کا جواب "نہیں" ہے ـــــ وہ صرف ایک مصوّر تھا نہ کہ معلّم۔ اُس نے ہمارے سامنے وہی پیش کیا جو اُس نے اپنے گردوپیش سے مطالعہ کیا مگر ایسا کرتے وقت وہ ہمیشہ اُس زندہ چنگاری کی جستجو کرتا ہے جو سرشتِ انسانی میں نہاں ہے۔ اُس کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ دنیاوی مصائب صرف کچھ عرصے کے لئے قائم رہتے ہیں اور زندگی اس قابل ہے کہ زندہ رہا جائے، اگر اپنی خاطر نہیں تو آنے والی [illegible] کی خاطر سہی۔ اس لئے کہ اُسے یقین تھا کہ چند صدیوں کے بعد رُوس سے مصائب کے بادل دُور ہو جائیں گے اور فضا مسرّت و انبساط کے نغموں [illegible] معمور ہو گی وہ اپنے مغموم طرزِ تحریر کے باوجود رجائی تھا۔

[illegible] میں ہم خوف زدہ، جاہل اور مفلس لوگوں کی تاریک تصویر دیکھتے ہیں۔ غریب طبقے، مزدوروں اور کسانوں کی زندگی اُنکی [illegible] جہالت، غربت، اور مختلف صورتوں سے مرکب ہے۔ چیخوف کی نظر میں سرمایہ داری ایک خونی آنکھوں والے دیو کے مشابہ [illegible] کارخانہ داروں اور مزدوروں دونوں پر حکومت کر رہا ہو۔ چنانچہ اُس کے افسانوں میں افسر، ڈاکٹر، پادری اور سوداگر کی تصویر ہمیشہ تاریک اور بھیانک پیش کی گئی ہے۔

فن کا مالک ہوتے ہوئے اُس کی قلمی تصاویر میں زندگی نمایاں طور پر جھلکیاں لیتی ہے۔ معاشرت کے جملہ عیوب، گھریلو زندگی اور دہقان کی خشک زندگی ایسے اہم موضوعات پر چیخوف کا قلم بہت روانی سے چلتا ہے۔ یہ فن کاری کسی اور صناع کو نصیب نہ ہوئی۔

اُس کے بیشتر کردار قوتِ عمل کے فقدان، نازک فطرت یا ضبطِ نفس کے انحطاط میں گرفتار ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر یا تو خودکشی کر لیتے ہیں یا تسکینِ قلب کے لئے شراب سے دوستی کر لیتے ہیں۔ ان کرداروں کا کوئی لائحہ عمل نہیں ہوتا۔ وہ اکثر کام سے دل چراتے ہیں۔ اگر وہ کچھ کر سکتے ہیں تو صرف یہ کہ تمام وقت تخیل کی بلندیوں میں پرواز کرتے رہیں یا خوابوں کا ایک باریک جال سا بنتے رہیں۔ اُنکی خوابنما زندگی سراب سے معمور ہوتی ہے جو جلد یا بدیر دھوکا دیکر ان جال بننے والے خیالی انسانوں کو حقیقی زندگی کے بے پایاں ریگستان میں تنہا چھوڑ دیتی ہے۔ وہ عریاں حقیقت کو اُس وقت دیکھتے ہیں جب اُن کے حسیات و جذبات مردہ ہو چکے ہوتے ہیں تب وہ بیچارگی محسوس کرتے ہیں کہ کتابِ حیات از سر نو شروع نہیں ہو سکتی

چیخوف جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے صرف ایک حقیقت بیان مصور تھا اور اس کا مطمحِ نظر زندگی کو اس شکل میں پیش کرنا تھا جیسی وہ ہے ذکر شاہراہِ حیات سے ہٹ کر کسی خاص چیز کی تعلیم دینا۔ اُس کی نظر میں ہر انسان کی قدر و قیمت تھی اور وہ اسے صرف ایک ذریعہ تسلیم کرنے کا منکر تھا ماضی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتا ہے "ماضی، واقعات کی لا متناہی و غیر مختتم زنجیر سے حال کے ساتھ جکڑا ہوا ہے دونوں ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں"۔

چیخوف کے متشائم نظریۂ حیات کی چاشنی اُس کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں بدرجۂ اتم موجود تھی مگر معاشرت کی تنگ نظری اور دیگر سیاسی مصائب سے اُن کے اذہان کی عنانِ توجہ عوام سے ہٹ کر انفرادیت کی طرف مبذول ہو گئی —— اُن میں سے بہت کم چیخوف کے مانند عالی حوصلہ جنگی ثابت ہوئے۔

چیخوف کی زندگی نفس آخر تک پُرسکون ہی اُسے اپنی زندگی میں کبھی غیر معمولی حادثے سے دوچار نہ ہونا پڑا۔ افسانوں کے علاوہ اُس نے روس کے مختلف تھیٹروں کے لئے ڈرامے بھی لکھے جو اُس کے افسانوں کی طرح بہت مقبول ہوئے مگر اُن ڈراموں کی تعداد افسانوں کی نسبت بہت کم ہے۔ [illegible] صدی کے آخری چند سالوں تک روس میں کوئی قابلِ ذکر تمثیل نگار موجود نہ تھا۔ اگر اس زمانے میں چند ڈرامے لکھے بھی گئے تو وہ [illegible] ہیں۔ دراصل اُس وقت ڈراما نویسوں نے صرف لوگوں کے تفننِ طبع کے لئے انسانی زندگی کی کچھ نقلیں لکھی ہیں۔ [illegible] نہیں ہے۔

سب سے پہلے لیمن ساف نامی ایک شخص نے چند المیہ ڈرامے لکھے۔ اس کے بعد سمروکاف متعدد مزاحیہ و المیہ ڈرامے ضبطِ تحریر میں لایا مگر وہ فنی اعتبار سے سقیم ہیں۔ اس کے بعد روس کے مایۂ ناز شاعر پشکن نے شیکسپیر کے افکار سے متاثر ہو کر ایک تمثیل لکھی۔ گو قابل مصنف نے اپنے کرداروں کے نفسیات کا بیان کمال فن کاری سے کیا ہے مگر پھر بھی اُس کی وہ تصنیف تمثیل نہیں کہلائی جا سکتی۔ وہ ایک تمثیلی نظم ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پشکن ایک اعلیٰ درجے کا تمثیل نگار نہیں بلکہ ایک مستند غنائی شاعر تھا۔ پشکن کے بعد اوسترووسکی نے ڈرامے میں حقیقت نگاری کا عنصر داخل کر دیا۔ دراصل حقیقت نما ڈراموں کو روس میں مروج کرنے کا سہرا اُسی کے سر ہے۔ مگر اُس نے اپنے بعد کوئی قابل جانشین نہ چھوڑا جو اُس کی متعارف صنف کو بامِ رفعت پر پہنچا سکتا۔ اوسترووسکی کے بعد جو تمثیل نگار پیدا ہوئے وہ بالکل نااہل تھے چنانچہ تمثیل نگاری دنیا کے مفکرِ اعظم طالسطائی کے ظہور تک دبی رہی۔

یوں طالسطائی نے متعدد کتابیں اور بے شمار مضامین لکھے جو ادبِ حاضرہ میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ اُس نے چند بلند پایہ ڈرامے بھی سپردِ قلم کئے جو حلقۂ ادب میں بہت مقبول ہوئے۔

طالسطائی کے تین ڈرامے اسٹیج ہو چکے ہیں۔ اُس کا نصب العین کسانوں کی قابلِ رحم حالت کی عکاسی کرنا اور انہیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنا ہے۔

روسی ڈرامے میں پہلا انقلاب چیخوف کی پہلی تمثیل "سی گل" سے پیدا ہوا۔

چیخوف شاید تمثیل نگاری کی طرف کبھی توجہ نہ کرتا اگر وہ ایک خام اور اغلاط سے پُر ڈرامے کو نہ دیکھتا۔ چیخوف اس ڈرامے کے عیوب کو برداشت نہ کر سکا۔ آخر اس تکدر نے اُس کی عنانِ توجہ تمثیل نگاری کی طرف مبذول کر دی اور اُس نے کچھ عرصے کے بعد "آن دی ہائی روڈ" نامی ایک ڈرامہ سپردِ قلم کیا مگر وہ چند وجوہ کی بنا پر اسٹیج نہ ہو سکا۔ چیخوف نے ہمت نہ ہاری اور جلد ہی "ایوانوف" کے عنوان سے ایک ڈرامہ اسٹیج کے لئے پیش کیا۔

گو ایوانوف کو اسٹیج پر کافی قبولِ عام حاصل ہوا مگر درحقیقت یہ تمثیل جملہ خوبیوں کی حامل نہ تھی یہ صرف چیخوف کی ابتدا تھی۔

اپنے ڈرامے کا قبولِ عام دیکھ کر اُس نے فوراً ہی ایک اور تمثیل لکھنا شروع کر دی مگر اُس کے متعلق حوصلہ شکن تبصرے دیکھ کر اُس نے اُسے وہیں کا وہیں رہنے دیا اور کچھ عرصے کے لئے متین و سنجیدہ تمثیل نگاری سے کنارہ کش ہو کر چند ایک ایکٹ کی کامیڈیز لکھیں، جن میں "ریچھ"[1] اور "لبسنت" بہت مشہور ہیں۔

یہ ایک ایکٹ کے ڈرامے چیخوف کا مخصوص مزاحیہ رنگ اور ظرافت کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں چیخوف نے ایک بار پھر سنجیدہ تمثیل نگاری کی طرف توجہ کی اور ایک ڈرامہ "سی گل" لکھا۔ اس کے بعد "چیری آرچرڈ" اور "تھری سسٹرز" شائع ہوئے اور اسٹیج پر خوب چلے۔

چیخوف کی تمام تصانیف انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

۴ جولائی ۱۹۰۴ء کو اس باکمال انسان نے موضع بیڈن ویل میں وفات پائی۔ ماسکو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

سعادت حسن منٹو

---

[1] یہ دو مطائبات راقم الحروف کے ترجمہ کردہ ہیں۔

شاعر و ناظم کی سرحدِ امتیاز

کائنات اور کائنات کا ہر ذرہ نیرنگیوں کی ایک دنیا ہے۔ جہاں شہود دھنا کی رنگینیاں فردوس نظر ہیں۔ رنگ و بو کی جنت نگاہی شعر و نغمہ کی سینکڑوں فردوس آہنگیاں اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے ـــ اگر ایک نیرنگیِ تماشا ہے تو یہ بہار تصور ـــ یہی وہ سرحد ہے جس سے ایک ایسے عالم کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں جہاں حُسن اپنی حقیقی رعنائیوں کے ساتھ بے حجاب نظر آتا ہے اور عشق اپنی آخری منزل پر مسرت و انبساط کے نغمے الاپتا ہے۔

دوشیزۂ سحر کا معصومانہ تبسم، سورج کی سنہری کرنیں، شفقستانِ شام کا میکدۂ رنگیں، بانوئے شب کی کاکلِ مشکیں ـــ بہار اور بہار کی حسن آفرینیاں، چمن اور چمن کا محشر شباب ذوقِ نظر کے لئے دعوتِ نظارہ ہیں

صبح زرنگار کے جھٹپٹے میں ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں، شام لالہ کار کے دھندلکے میں کوہساروں کا منظر دلکش، رات کی خمار آگیں فضا میں گنگا کے کنارے بے تاب موجوں کا سسک سسک کر سو رہنا ـــ فردوس نگاہ ہے، نگاہیں مشاہدات کی رنگینیوں پر بے تابانہ پڑتی ہیں۔ حُسن کا ہر خط و خال نظر میں کھب جاتا ہے ـــ ہے یہ نیرنگیِ تماشا۔

کچھ ایسی ہستیاں بھی نظر آئیں گی جن کے حواس ظاہری ملکہ ملکوتی کے ماتحت کام کرتے ہیں ان کی نگاہ شوق مشاہدات کی وادیوں میں نہیں بھٹکتی بلکہ محسوسات کے سراب زار سے گزر کر تخیلات اور تصورات کی رنگین فضاؤں میں کھیلتی ہے ـــ یہ ہے بہارِ تصور

یہ وہ عالم ہے جہاں رنگ و بو کے نظر فریب حجابات اور رنگینیوں کے جادو نگاہ پردے اُٹھ جاتے ہیں اور حُسن حقیقی اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ بے نقاب نظر آتا ہے۔ اس دنیا کی رہنے والی ہستیاں تعینات کی پابندیوں سے آزاد ہوتی ہیں اور ان کی کائنات محسوسات جسم و گوش کے رومان و نغمہ سے بے نیاز ہوتی ہے۔ ان کے کان قدسیوں کے نغمے سنتے، ان کے تار ہائے روح اجرام نوریں کے زمزموں سے مرتعش ہو جاتے اُن کے دل کی ہر صدا فضائے عرش کی نشاط آہنگیوں کی بازگشت ہوتی ـــ پہلے سے تعلق مصور کو ہے اور دوسرے سے شاعر کو ـــ

جس طرح ایک مصور رنگ و روغن کی مدد سے مشاہدات کی تصویر کھینچتا ہے، اسی طرح اور ٹھیک اسی طرح شاعر شعر و نغمہ میں ڈوبے ہوئے الفاظ کے ذریعہ محاکات و تشبیہات کی مدد سے کبھی مشاہدات کی اور کبھی تخیلات و تصورات کی تصویریں کھینچتا ہے۔

شاعر کی دنیا ایک روحانی دنیا ہے ـــــ وہ ایک ایسے عالم میں رہتا ہے جہاں حسن حقیقی کی کرنیں چمکتی، جہاں شبنم کی جگہ محبت کی بارش ہوتی، جس کی فضا میں شعریت اور روحانیت سانس لیتی، جہاں موجوں کی آغوش میں موسیقیت سوتی ہے۔

شاعر کی دنیا سب سے نرالی اور انوکھی ہوتی ہے۔ وہ کبھی گلاب کی سرخ پنکھڑیوں کو دیکھ دیکھ کر جھومتا ہے، کبھی سنبل کی زلف پرشکن میں اُلجھتا ہے ـــــ لیکن جب وہ ہمہ تن شعر و نغمہ بنجاتا ہے تو کبھی رنگ و بُو کے طلسم سے آگے نکل جاتا ہے۔ اور کبھی اپنی دنیا میں کھویا سا رہتا ہے ـــــ اس کی وسعتِ نظر زمان و مکان ہی تک محدود نہیں، بلکہ تعینات کے حجابات کو دور کرتی ہوئی عرش الٰہی اور فضائے لامکاں تک پہونچ جاتی ہے۔

شاعر ملہم، ترجمانِ حقیقت، اور عکاس فطرت ہے، اُسے نسبت پیمبری حاصل ہے ؎

شعر گوئی نہ سمجھنا کہ مرا کام ہے یہ ــ غالبِ شعر میں آسی نفسِ الہام ہے یہ

ـــــ (حضرت آسی سکندر پوری) وہ قدرت کے راز سربستہ سے واقف ہے، اُس کی حقیقت بین نگاہیں حیات انسانی کی باریکیوں سے ناآشنا نہیں اور وہ حیات مادی کی غرض و غایت کو خوب سمجھتا ہے اُس کا دل محبت کی ایک وسیع دنیا ہے۔ جہاں وہ بیخودی میں پریم پجاری اور وجدانیت میں پریم مراری ہے۔ وہ نازک گلاب کی پنکھڑیوں کے ہر خطِ احمریں میں مستی و کیف کی ایک حسین کائنات دیکھتا ہے جہاں خود اس کی آرزوئیں حسن کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائی جا رہی ہیں ـــــ

رُت بھری، ہوا بدلی، تو رس بہار کلی کلی کھلانے اور چمن چمن میں جگنو اُڑانے لگی ـــــ شاعر نے نگاہ ڈالی ـــــ آنکھیں بند ہوگئیں ـــــ مُنہ سے نکلتی ہوئی ایک آہ نکلی ـــــ شاعر کبھی اپنے طفلی کی ویران اور خزاں رسیدہ وادیوں میں کھو گیا اور کبھی شاخِ گل کے نیچے چند پریشاں بال و پر کی روداد شبینہ کی ترجمانی کرتے ہوئے نالۂ غم کی بازگشت بن گیا۔ اُس کے دل کی وادیوں میں ایک صدا گونجی ؎

فصلِ گل آئی ہرے ہوگئے سب برگِ شجر ــ لہلہا اُٹھی گل تر

آج گلشن میں مگر بلبلِ ناکام نہیں ــ باغ سونا ہی پڑا

شاعر جو کہتا ہے اُس کے بربط دل کی بازگشت اور سازِ روح کا ارتعاش ہے۔ شعر کہنے کے لئے نہ تو کسی خاص جگہ کی شرط ہے اور نہ تعین اوقات کی ضرورت ـــــ وہ شعر کس طرح کہتا ہے اور کیونکر کہتا ہے بیان کرنے کی چیز نہیں ـــــ وہ قصداً کچھ نہیں کہتا ہے وہ مجبور ہے کوئی مستور طاقت اس کے تارہائے روح کو چھیڑتی ہے، نغمے اشعار کی صورت میں پھوٹ کر نکلتے ہیں ؎

کہاں دماغ کہ شعر و سخن کی فکر کروں + کسی کی چھیڑ سے کچھ گنگنا رہا ہوں میں

ـــــ وہ ہر قید و بند سے آزاد اور ہر پابندی سے بلند و ارفع ہے۔ اس کے پہلو میں ایک درد، دل میں ایک کسک اور جگر میں ایک ٹیس ہوتی ہے۔ اُس کی زندگی محبت، اُس کا مذہب محبت اور اس کا خدا محبت ہے۔

سچا شاعر کسی کے کہنے سے اچھا شعر نہیں کہہ سکتا ہے۔ لیکن جو اشعار اس کے جذبات دلی اور واردات قلبی کی بازگشت ہوتے ہیں وہ ایک دہکتی ہوئی آگ ہوتے ہیں جن کے ایندھن میں شاعر اور شاعر کی کائنات محسوسات جل بھُن جاتی ہے۔ شاعر کے نغمات الہامی حواس ظاہری کو اس درجہ متاثر نہیں کرتے جتنا روح کی گہرائیوں تک اُتر کر دنیائے تخیلات میں ایک انقلاب پیدا کردیتے

جیسا شاعر سکتا ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ شعر بھی نظم کرے ایک وہ شخص جس نے عمر بھر میں صرف ایک مصرع موزوں کیا یا ایک مصرع بھی موزوں نہ کیا ہو پھر بھی شاعر ہو سکتا ہے اور شاعرِ فطرت۔

شاعر کو نسبت پیمبری حاصل ہے جس طرح پیغمبر خدا کا پیغامبر ہے اسی طرح شاعر کا کلام پیام ہوتا ہے۔ سرمستی و بیخودی، حزن و خوشی شاعری کی بنیاد اساسی ہیں۔ اگر ایک رجائی (Optimistic) شاعر کی آنکھیں ذرہ ذرہ میں امید و کامرانی کی جھلک دیکھتی ہیں اور وہ اپنے غیر فانی ترانوں کے ذریعہ دوسروں کو مسرت حیات کا راز بتاتا ہے تو دوسری طرف قنوطی (Pessimistic) شاعر یاس و حرماں کی موجوں میں ہچکولے کھاتا ہے اور اس کا ہر تارِ نفس حسرت و یاس کا نغمہ الاپتا ہے ——— انھیں دونوں یعنی رجائیت یا قنوطیت کی فراوانی سرمستی و بیخودی پیدا کرتی ہے جس کے تاروں سے شعر و نغمہ پھوٹ کر نکلتا ہے ——— یہ کیفی حالتیں ہیں جنھیں وہ شخص جو صرف ناظم ہے نہیں پہونچ سکتا ——— وہ شخص جس کی زندگی کا بیشتر حصہ جذبات لطیف، رفعت تخیل اور وجدان فطری سے معرّا رہا ہو ان حالتوں سے واقف نہیں ہو سکتا شاعر سیدھے سادے الفاظ میں جو کچھ کہہ جاتا ہے وہ نہ صرف کانوں میں گونجتے ہیں بلکہ کائنات ہوش و حواس پر محیط ہو کر فضائے روح میں ابدی ارتعاش اور سرمدی کیف پیدا کر دیتے ہیں۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ حال ہے قال نہیں ہے۔

ناظم وہ ہے جو اوزان و بحور کے ماتحت مقفیٰ بالقصد کہہ سکتا ہو۔ ایک ناظم شاعر بھی ہو سکتا ہے اور ایک شاعر ناظم بھی پھر بھی ان دونوں میں امتیاز و تباین ہے جہاں شاعر فطرت کا ترجمان ہوتا ہے وہاں ناظم وہ شخص جو صرف مسلمات کی تمثیل نگاری کی کوشش کرتا ہے۔ ناظم کے دلیں جذبات صادقہ کی لہریں نہیں اٹھتیں بلکہ دوسروں کی کیفیتوں کو دیکھکر سطحی انداز میں نقل کرنے کی کوشش کرتا ہو اسکے جذبات و کیفیات بیت ارادی اور بناوٹی ہوتے ہیں۔ ناظم الفاظ کی شاعری کرتا ہے وہ جو کچھ کہتا ہو قال ہو، اس نے حال و مستی کی شراب آتشہ کبھی نہیں پی اس نے کیف بیخودی کے نغمے کبھی نہیں سنے۔

شاعری انسان کی فطرت کا جزو لاینفک ہے لیکن ماحول کی شعلہ سامانیاں اس جزوِ لطیف کو فنا کر دیتی ہیں۔

ہر قوم میں شاعری پیدا ہوئی، پلی، پروان چڑھی ——— ہر زبان نے شاعری کے پودے سینچے اور سینچ سینچ کر چمن زار بنا دیئے لیکن سبھوں کا رنگ و بو متشابہ و متباین ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ مختلف زبانوں کے اصناف شاعری پر روشنی ڈالوں لیکن وقت بہت کم ہے اس لیے سردست گلزار اردو کے مختلف گلدستے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں

سرزمین اردو میں شاعری کا چمن قطب شاہیوں کے عہد میں لگایا گیا، دکنی بادشاہوں نے اس کی رکھوالی کی مدتوں سینچتے چلے آئے ——— آخر ولی دکنی کا زمانہ آیا ——— گلزار سخن میں بہار آئی، ہری شاخوں میں کونپلیں پھوٹیں شاعری کا گلِ نوزس خلد در خلد بن کر لہلہایا

ہر قوم میں شاعری کا رنگ بنیاد فطری اور حقیقی جذبات کے ماتحت رکھا گیا۔ ابن قدامہ اور ابن رشیق نے اہل عرب کی عاشقانہ اور فطری شاعری کا خاکہ کھینچا ہے اُن کا خیال ہے کہ عشق و محبت کی شیفتگی و فریفتگی، سوز و گداز، رقت و لطافت، خاکساری و اطاعت غزل گوئی کی جان ہیں طرح طرح نفعی کے وہ اشعار جن میں معشوق کی جسمانی تعریفیں کی گئیں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھے گئے مثلاً

ممسودہ خلقت فعلیتا   خوط و معقد مطاعبل

معنی:- اس کا جسم گٹھا ہوا ہے جس کا بالائی حصہ نازک شاخ ہے اور اس کے
چادر باندھنے کی جگہ پر گوشت ہے

صنف لطیف ہی ہمیشہ مخاطب ہی اور معشوقوں کے فرضی نام مثلاً
سلمیٰ، لیلیٰ، لبنیٰ وغیرہ رکھے گئے مثلاً

وما کان طبی حبہا غیرانہ یقام بسلمی للقوافی صدورہا

معنی:- اس کی محبت میری عادت نہیں البتہ سلمیٰ کے نام سے شعر
درست کئے جاتے ہیں

لیکن اردو کی بدنصیبی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے —— یہاں شاعری کی بنیاد غیر فطری اصول اور پست جذبات پر رکھی گئی ہے صنفی شاعری میں اصول فطرت یہ ہے کہ اگر خطاب عورت کی جانب سے ہے تو مرد مخاطب اور اگر مرد کی جانب سے ہے تو عورت مخاطب ہی ہے —— ناز و نیاز حسن و عشق کی یہ سچی تصویر ہے۔ لیکن اردو کی دنیا ہی نرالی اور انوکھی ہے شیرازی بادۂ رنگیں کا ایسا نشہ چڑھا کہ حسن نسائی کے معصومانہ تبسم کی جگہ سبزۂ خط نے لیا اور امرد پرستی کا میخانہ گرم ہوا۔

میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جہاں تک شاعری اور فطری شاعری کا تعلق ہے اردو کا دامن ایک حد تک اس سے خالی ہے یہ اصول فطرت ہے کہ زوجی اور جنسی محبت اصناف متضاد میں ہوا کرتی ہے —— یہی ایک نقطہ ہے جہاں اردو شاعری کی بنیادیں ملجاتی ہیں فطری جذبات اور وجدانِ حقیقی کے فقدان سے شعور شعریت کا خاتمہ ہوجاتا ہے —— یہی وجہ ہے کہ اگر انصاف و صداقت کی عینک لگا کر دیکھا جائے تو اردو شعرا کی فہرست میں صرف چند شاعر رہنما ستارے کی طرح سینکڑوں ناظموں کے جھرمٹ میں نظر آئیں گے۔ اب آئیے اور اردو کے گلزار سخن کی گلچینی کیجئے۔ حقیقت نگر آنکھوں سے دیکھئے کہاں رنگا رنگ پھولوں میں کتنے پھول ہیں جن میں فطرت کے خمارِ حسن کی انگڑائیاں خوابیدہ ہیں، کتنی کلیاں ہیں جن کے لبوں پر قدرت کا رنگین تبسم تڑپ رہا ہے۔ ولی دکنی سے شروع کیجئے۔

متقدمین کا دورِ اوّل

(الف) ولی دکنی:-

ولی دکنی اردو غزلگوئی کا پیشرو کہا جاتا ہے۔ اگرچہ ولی کے کلام میں بھی ابتذال و پستی موجود ہے گرچہ ولی کے کلام میں بھی امرد پرستی کے جذبات نمایاں ہیں ——

(۱) ہے خوش قداں میں آج کمالِ گوبند لال
استاد چال سرو ہے چالِ گوبند لال
خوباں جہاں کے عرق عرق ہوں تو کیا عجب
جس وقت جلوہ گر ہو جمالِ گوبند لال

(۲) شمع بزم وفا ہے امرت لال
سرو باغ ادا ہے امرت لال
اے ولی کیا کروں بیاں اس کا
لطف میں دلربا ہے امرت لال

پھر بھی ولی کے کلام کا بیشتر حصہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اشعار میں بھی شعریت تھی ——

آئیے چمنستانِ ولی کی سیر کیجئے۔ اگر ایک طرف گلہائے تخیل فردوس شام بنکر فضائے روح کو مہکا رہے ہیں۔ تو دوسری طرف سلسبیل جذبات کی موجیں اٹھ اٹھ کر شعر و نغمہ کا آبشار بہا رہی ہیں مثلاً ——

(۱) اشک خوں آلود ہے سامانِ طغرائے نیاز

ہر فرنش وفاداری ہے داغ عاشقی

(۲) غرور زرسوں بجا ہے سکوت بے معنی
کہیے صدا ہے سدا کو ہمار خاموشی

(۳) مند گلُ منزل شبنم ہوئی
دیکھ! رتبہ دیدہ بیدار کا

(۴) ہر ذرہ اسکی چشم میں لبریز نور ہے
دیکھا ہے جس نے حسن تجلی بہار کا

(۵) معشوق کو ضرر نہیں عاشق کی آہ سوں
بجھتا نہیں ہے باد صبا سوں چراغ گلُ

(۶) گلُ مقصد کا ہار ڈالے ہیں
نقد ہستی جو ہار ڈالے ہیں

ولی کے کلام کا بیشتر حصہ اسی رنگ میں نظر آئے گا۔

گرچہ پانچ ندی کے کنارے براجنے والی ماں نے اردو جیسا لال بھاشا کی کتھا میں جنا لیکن یہ بچہ پیدا ہوتے ہی شاہی محلوں میں داخل کر دیا گیا۔ مغل شاہزادیوں نے آغوشِ محبت میں لیا۔ شیرازی دائیوں سے دودھ پلوایا۔ بچے نے جب آنکھیں کھولیں تو بزم جم اور رزم کی کہانیاں سُنیں، کرشن گوپیوں کی پریم کتھا اور مہابھارت کے مہابلیوں کی تلواروں کی جھنکار سے کان آشنا ہی رہے نتیجہ یہ ہوا کہ جب طفلِ اردو نے ڈیگاڈیگی شروع کی تو فارسی ہی بانسدیے، بزم حُسن میں رنگینی اور پدماوتی کی جگہ ترک بچوں نے لی اور جب ترک بچوں کی کمی دیکھی گئی تو مندروں کے زنار بند برہمن بچے لاکر بٹھا دیئے گئے۔

یہی وجہ ہے کہ ولی کے کلام میں اس طرح کی خامیاں پائی [illegible] یہ خامیاں نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔ آج بھی ولی کے سازِ شکستہ سے شیر و نغمہ پھوٹ کر نکل رہے ہیں۔ سطحی خامیوں کے باوجود بھی ولی شاعر تھے۔ اُن کا کلام تصنع اور ابتذال سے بہت کچھ پاک ہے۔

(ب) ولی اسکول کا دور اوّل

ولی اسکول کا دور اول ولی کے اثر سے بہت کچھ متاثر رہا۔ ولی کے لیے یہ دور شعریت کا دور نہ تھا بلکہ تصنع، نقالی اور لفظی تک بندی کا زمانہ تھا۔ جس وقت ولی کے اشعار حسین ترانوں کیطرح ولی کی فضا میں گونجے شاہ مبارک آبرو شاکر ناجی، شیخ شرف الدین مضمون، مصطفےٰ خاں یکرنگ وغیرہ ایرانی میکدوں سے باہر نکل پڑے اور طفل اُردو نے ولی کے ہاتھوں جو شاعری کا رباب چھیڑا تو یہ بھی سُن سُن کر جھومنے لگے اور خود بھی نئے سازوں کو چھیڑا۔ نغمہ موسیقار کو بھُول بھلا کر ہندی راگ الاپنا چاہا لیکن جو دیپک راگ دکنی شاعر نے الاپا تھا وہ انھیں نصیب نہ ہوا۔

اس دور کی خصوصیت ایہام گوئی یعنی رعایت لفظی ہے۔ ان کی شاعری پہیلیوں کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ گرچہ ولی اسکول میں یہ دور نہایت ہی غیر شاعرانہ کہا جا سکتا ہے۔ پھر بھی لکھنو اسکول کے ابتذال اور پستیٔ اخلاق کو دیکھکر یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ولی اسکول کے دور اول کے شعرا ناظم تھے لیکن ایسے ناظم جن کے تارہائے روحِ شعریت کے زخمۂ مضراب سے گونجا کرتے۔ میر صاحب شاکر ناجی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں ـــــ

"مزاجش بیشتر مائل ہزل بود ـــ معاصر میاں آبرو ـــ بندہ بادیک دو ملاقات کردہ بودم شعر ہزل خود میخواند و مردماں را بخندہ می آرد و خود ہم نمی خندید گر گاہے تبسمے میکرد۔"

ان شعرا کی داستاں پاستان سنئے اور جھومئے —— ایہام انکے اشعار کی جان ہے ذیل کے نشانات ان کی ایہام پرستی کی دلیل ہیں

آبرو

اب تو سجا ہے جا اس شوخ نے مکھن کا کیونکر ہے نہ ہم سے وہ یار سر کشیدہ
مجھ ناتواں کی حالت وہاں جا کہو تو اُڑ کر میرا یہ رنگ زرد ہے گویا لکھی کبوتر

شاکر ناجی

اُس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں عارضی میری زندگانی ہے
اما محق بولنے لگتا ہے اُسکے زخم کا بسمل کٹاری آبدار اُس شوخ کی منھ زبانی ہے

مضمون

کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج

گل رنگ

اگر آوے مرے گھر وہ بیارا کروں اُس ماہ کو پتلی کا تارا

متقدمین کا دوسرا دور —— دلّی اسکول کا دورِ ثانی

یہ دور شاعری کا دور تھا۔ لیل و نہار کے آوا گون نے تخیلات بہت بلند کر دئیے اس دور میں ایسی ایسی مایہ ناز ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے اردو شاعری کو کیا بلحاظ زبان اور کیا بلحاظ تخیلات و جذبات —— شعریت —— چار چاند لگا دئیے۔

اس دور میں شاعری نے اصلی روپ میں اُردو میں جنم لیا لیکن اُردو کی گود میں اس کے بعد پھر بھی قلب ماہیت ہو ہی گئی

تجدید و اصلاح زبان کا کام مرزا مظہر جانِ جاناں فقیر شاہ حاتم وغیرہ نے کیا اور شعریت کی روح میر سوداؔ اور میر دردؔ کے ہاتھوں پھونکی گئی۔ یہاں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دور میں کتنے ناظم تھے اور کتنے شاعر۔

فغاںؔ، مرزا مظہر جانِ جاناں شاہ حاتم وغیرہ نے زبان کی بہت کچھ اصلاح کی اگر ایک طرف شعر و سخن کا خارجی پہلو اُن کے ہاتھوں بہت کچھ درست ہوا۔ تو دوسری طرف ان کی شاعری کا داخلی پہلو بھی بہت کچھ شور و نغمہ کا حامل ہے

حاتم

آب حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا
ناسور کی صفت ہے نہ ہوگا کبھی وہ بند جرّاح زخم عشق کا آکر سیا تو کیا

فغاں

اتنا و نور خوش نہیں آتا ہے اشک کا عالم کوں مت ڈبو ئیو اے چشم تر کہیں
تیری گلی میں خاک بھی چھانی کر مل ملے ایسا ہو گم ہوا کہ نہ آیا نظر کہیں

مظہر

(۱) چل اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا
ڈبویا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا

(۲) لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے مردوں کو بھی ستاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آئی ہے بہار

انصاف کی آنکھیں کھولئے اور حقیقت نیوش کان دھر کے سنئے —— یہاں نہ استعارات کی رنگینی ہے اور نہ ایہام کی دھوم دھام —— جو کہا صاف زبان اور سیدھے سادے محاوروں میں کہا جو سنتا ہے سر دُھنتا ہے —— سادگی ایسی کہ سینکڑوں رنگینیاں قربان ہیں ——

اس بھولے پن پر بھی وہ ملاحت ہے کہ زبان چٹخارے لیتی ہے۔ انکا کلام قال نہ تھا حال تھا۔ کلام تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے ـــــ یہ ناظم بھی تھے اور شاعر بھی۔

مرزا مظہر، فغاں، حاتم وغیرہ کا راگ تو سُن چکے ـــــ اب میر کے نالے اور سودا کی نغمہ سنجیاں بھی لگے ہاتھ سُن لیجئے۔

شاعری حال ہے اور نظم سرائی قال ہے۔ زمانہ کے ہاتھوں میر نے کبھی سکھ چین نہ پایا۔ لڑکپن کی یتیمی اور کس مپرسی، جوانی کا جنون عشق اور پھر حسرت و ناکامی کی رام کہانی ـــــ یہ فطری اسباب تھے جنھوں نے میر کو شاعر بنادیا۔ اگر انصاف اور ایمان سے دیکھا جائے تو اردو زبان میں میر کی شاعری سچی شاعری ہے اور غالب اور شاد عظیم آبادی کے سوا انکا کوئی جانشین نظر نہیں آتا۔ جو کچھ میر کہہ گئے آج سو برس کے بعد بھی قلب کو تڑپا اور روح کو گرما دیتے ہیں۔ میر نے جو آتشیں نغمے الاپے آج بھی ملکوتی ترانوں کی طرح روح کی گہرائیوں میں اُتر کر ارتعاش پیدا کر رہے ہیں۔ استعارات و تشبیہات کی رنگا رنگی ایکطرف اور ان کی فطری سادگی ایکطرف ـــــ سچ پوچھئے تو میر صاحب سیدھے سادھے محاوروں میں جو کچھ کہہ گئے وہ سوز و گداز کی سینکڑوں دنیا اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں ـــــ آج کیا جب تک انسانی دنیا ہے اور شعریت کا زمزمہ روح کے ساز میں چھڑا ہوا ہے میر کی نوائے دلخراش فضائے تخیل میں گونجا کرے گی۔ میر صاحب نے خود اس کی پیشنگوئی کی ہے ـــــ وہ شاعر فطرت تھے انہیں الہام ہوا۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنئے گا
پڑھتے کسی کو سُنئے گا تو دیر تلک سر دُھنئے گا

میر جو کچھ کہتے تھے ان کے جذبات دلی کی بازگشت تھی ان کا کلام درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان کا ہر مصرعہ سوز و گداز کی ایک وسیع دُنیا ہے جہاں ذرہ ذرہ ناکامیوں کے دُکھڑے سُناتا ہے، جہاں حسرت و یاس کی گھٹائیں اُمید و ارمان کو لوریاں دے دے کر سلاتی ہیں، جہاں محبت کی قربانگاہ پر آرزوئیں بھینٹ چڑھائی جاتی رہی ہیں۔ میر صاحب نے خونِ جگر بہا بہا کر اشعار کہے آج آپ بھی انھیں پڑھیے اور دو چار آنسو بہائیے۔

میر تقی میر

(۱)

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہمنے تھام تھام لیا
سرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں — تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

(۲)

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ — نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

(۳)

جو اس شور سے میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

(۴)

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا! اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں مُند
یعنی رات بہت تھی جاگے، صبح ہوئی آرام کیا
یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

سودا:- استعارات و تشبیہات کی رنگا رنگی، الفاظ کی دھوم دھام مضمون کی بلندی اور بندش کی چُستی اُردو شعرا میں سودا کو ممتاز کر رہی ہے۔ سودا ایسے اقلیم سخن کے تاجدار ہیں جہاں فصاحت آنکھیں بچھاتی ہے اور بلاغت قدموں میں لوٹ جاتی ہے۔

مرزا سودا مسلّم الثبوت اور ماہرِ فن ناظم تھے۔ انھیں الفاظ و زبان پر قدرت حاصل تھی وہ بلندی کے مضمون نہ لاتے آسمان سے تارے توڑ لاتے

تھے۔ میر صاحب کی سادگی کے برعکس یہاں مینا نگاری اور مرصع کاری نظر آئے گی۔ یہاں حال کی وہ مستی و بیخودی نہیں ہے بلکہ قال کی فردوس آہنگی اور نغمہ آفرینی ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ مرزا کا کلام جذبات و کیفیات سے معرا ہوتا تھا یہ ضرور ہے میر کے کلام کی سادگی اور سحر تاثیر میر تک مخصوص ہے ــــ یہی وجہ ہے کہ جہاں اردو غزلگوئی کا باغ میر کے دم قدم سے سرسبز ہوا وہاں قصیدہ کا حسن حصین مرزا کے ہاتھوں استوار ہوا۔ مجھے اعتراف ہے کہ مرزا ہجو میں عدیم المثال تھے لیکن ان کی ہجو گوئی بھی لکھنو اسکول کے ابتذال سے اچھی تھی۔ مرزا کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کامیاب ناظم ہونیکے ساتھ ساتھ مرزا شاعر بھی تھے۔ گو ناظم کی حیثیت سے مرزا واحد شخصیت کے مالک ہیں بحیثیت شاعر کے وہ میر سے پیچھے تھے۔ سودا کی قوت نظم ملاحظہ ہو۔ مثلاً

(۱)

نجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک ۔۔۔ دی میں آکے خوشی نے در دل پر تپک
پوچھا میں کون ہو؟ بولی کہ میں ہوں غافل ۔۔۔ نہ لگے شوق میں جسکی کبھو شائق کی پلک
ہے خوشی نام مرا میں ہوں عزیز دلہا ۔۔۔ زندگانی کی حلاوت ہے جہاں میں مجھ تک

(۲)

یار و مہتاب و گل و شمع ہم چاروں ایک ۔۔۔ ہیں کہاں بلبل و پروانہ ہم چاروں ایک
انوری، سعدی و خاقانی و مداح ترا ۔۔۔ رتبہ شعر و سخن میں ہیں ہم چاروں ایک
ایک دو نما ہوا اب اقلیم سخن میں ان کا ۔۔۔ رکھتے ہیں پر فلک طبل و علم چاروں ایک

مرزا کا شور و نغمہ بھی سنئے اور جھومئے ؎

مجھ صید ناتواں کے احوال کو نہ پوچھو ۔۔۔ محروم ذبح سے ہوں مردود ہوں قفس کا
لے زمزمہ پرواز چمن نالہ ہمارا ۔۔۔ وہ مرغ نہ سمجھے جو تہ دام نہ آیا
آدم کا جسم جبکہ عناصر سے مل بنا ۔۔۔ کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

مرزا کو قصیدہ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ اس صنف شاعری میں انشا اور ذوق کے سوا کوئی ان کا جانشین نظر نہیں آتا۔

یہاں ضرورت ہے کہ میر و مرزا کے ہم معنی یا ایک ہی قافیہ، ایک ہی ردیف اور ایک ہی بحر کے اشعار پیش کئے جائیں تاکہ دونوں کا معیار شعریت معلوم ہو۔ مثلاً

میر:-

ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے ۔۔۔ ورنہ عالم کو زمانہ نے دیا کیا کیا کچھ

سودا:-

سودا جہاں میں آکے کوئی کچھ نہ لے گیا ۔۔۔ جاتا ہوں ایک میں دل پر آرزو لئے

میر:-

چمن میں صبح جو اُس جنگجو کا نام لیا ۔۔۔ صبا نے تیغ کا موج رواں سے کام لیا

میر:-

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا ۔۔۔ دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

سودا:-

برابری کا تری گل نے جب خیال کیا ۔۔۔ صبا نے مار تھپیڑا منہ اس کا لال کیا

میر:-

چمن میں گل نے جو کل دعوئ جمال کیا ۔۔۔ جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

قدما کا تیسرا دور ــــــــــــ لکھنو اسکول

دلی کی داستان پاستان یہاں تک سن کر اب ذرا لکھنو کی کہانی سنئے۔ روحانی ساز کچھ دیر کے لئے خموش ہو گیا ــــ پرانی محفل اجڑ گئی۔ نئی مجلسیں سجائی جا رہی ہیں۔ نئے سازندوں نے ساز ملایا اور رسوا نغموں کی جگہ کہیں پہلوانان عشق بمصداق ؎

مجھ سے لڑتا ہے اب لیزم جنوں زنجیر کی
اور کرو مشق کی کہتا ہے تو مگدر اٹھا ۔۔۔ ناسخ

خم ٹھونک رہے ہیں اور کہیں بطور ؎

اپنی ہی شمع کو خدا نے دی ہے صورت نور کی
تیری ایڑی پر کروں صدقے میں چوٹی حور کی (رِند)

ٹھمانے اور ٹوسنے کے ترانے وصل کی راتوں میں گونج رہے ہیں۔ تالۂ نیم شبی اور آہِ لب بستہ کی جگہ اٹھلانے، اکتانے اور معاملہ بندی نے لی۔ تخیلات نے لفاظی اور جذبات نے ہوس کو جگہ دی۔ دل کی حکمرانی اُٹھ گئی زبان نے اپنی حکومت قائم کی۔ شعریت کے ملکوتی زمزمے یہاں سننے میں نہیں آتے۔

زمانے نے کروٹ لی، سنجیدگی اور متانت کا شیرازہ بکھر گیا، سوز و گداز بھرے نالوں کے بدلے قہقہوں اور تالیوں کی بازگشت نے گوش گردوں کر دیا۔ شاعری کے ساتھ اخلاق کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ نازک خیالی اور بلندیٔ مضمون ابتذال اور فحش گوئی میں مسخ ہو گئی —— غرضکہ اس اسکول میں تقریباً سب ناظم ہی ناظم نظر آئیں گے اور ناظموں کے جھرمٹ میں بھی سنجیدہ مذاق کے ناظم اِکّے دُکّے نظر آئیں گے

شعریت کے ساتھ ساتھ روح و دماغ کی آزادی بھی ختم ہو گئی حال کا طلسم ٹوٹ گیا، قال کی سحر کاریاں فردوس نگاہ اور جنت گوش بن گئیں دلی کی سلطنت اُجڑی تو شاہانِ اودھ نے ٹھاٹھ جمائی۔ دلی میں شاعری فقیر کی کٹیا میں پیدا ہوئی اور خانقاہوں میں پروان چڑھی لیکن لکھنؤ پہونچ کر اس نے روپ بدلا فقیر کی گدڑی اتار کر درباری بانے بدلے۔ جذبات و تخیلات کی ترجمانی مفقود ہو گئی، "آہ" دلی کی گہرائیوں میں سو کر رہ گئی اور "واہ واہ" کے نعروں سے محفلیں گونج اٹھیں، مشاعرے ختم ہو گئے اور شاعروں کی "پالیوں" نے رنگ جمایا۔ جب تک دلی کی خانقاہیں آباد رہیں اُردو شاعری کے نغمہ زار روحانی سے بھی تڑپتی تھی لیکن جب فقیر کی کٹیا اور پریم آشرم برباد ہوا اور اُردو شاعری نے لکھنؤ کے درباروں میں پناہ لی تو وہ روحانی نغمے اور فطری ترانے فضا میں گم ہو گئے اور زیر و بم کے شور کی طرح لکھنوی شاعری کی صدا اونچے محلوں اور رنگین محفلوں میں گونجی۔ پازیب اور خلخال کی جھنکاریں فضائیں ڈوب گئیں

اس میں شک نہیں کہ دربار داری کی لفاظیوں اور ہرزہ سرائیوں نے قوتِ نظم کو بڑھا دیا لیکن شاعری کا تو خاتمہ ہی ہو گیا۔ خوشامدانہ خیالات اور غلامانہ جذبات شاعری کا مال ہو گئے۔ شعر نظم کرنے میں تو اس قدر یدطولیٰ حاصل ہو گیا کہ سخت سے سخت زمینوں میں اشعار کہے جانے لگے۔ لیکن الفاظ کی فلک رفعت عمارتیں، نازک خیالی معنی آفرینی اور جذبات فطری کی آبادیوں سے خالی پڑ گئیں۔ شاعری ایک پیکرِ بے جان ہو کر رہ گئی، امرا اور سلاطین کی پسند معیار سخن کے لئے سند قرار پائی چنانچہ قائم چاندپوری فرماتے ہیں ؎

مانوں گا شاعری کو میں قائم تب ہی تری
سرسبز یہ غزل ہو جو نواب کے حضور

روحانی جذبات کی جگہ ہوس نے لی۔ شعر و سخن کی محفل میں کوکباتی شمعیں جلائی گئیں شعرا کبھی کنگھی اور چوٹی میں اُلجھنے لگے، کبھی دہنِ یار کی تلاش اور کمر کی جستجو میں کھو گئے —— یہی نہیں —— بلکہ شہوانی جذبات کی ترجمانی ہونے لگی مثلاً ؎

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چمپئی رنگ اُسکا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

شبِ وصل گزارنے والوں نے "رقیب روسیاہ" کی خوب گت بنائی اور رندان مست نے حضرتِ واعظ اور جناب زاہد کی خوب پگڑی اُچھالی۔ تعجب تو یہ ہے کہ اُن کا معشوق نہ تو مرد تھا نہ عورت بلکہ کوئی غیر فطری انسان تھا جس کی کرایسی موہوم تھی جو کہ شیر لانے بھی نہ ملسکتی اور دہن ایسا خیالی جس کی تصویر خواب میں بھی نہ

دیکھی جاسکتی ——

لکھنؤ اسکول کا رنگ متقدمین و متوسطین تک رہا۔ لیکن اس دور میں مصحفی نے آتش کبھی کبھی شاعری کے جسم بے جان میں روح پھونکتے رہے۔ متاخرین نے بہت کچھ اصلاح کی اور دورِ حاضرہ میں تو شاعری پھر از سرِ نو زندہ ہوئی۔ اس سے انکار نہیں کہ ناسخ جن سے ناظموں کے بیان میں کبھی جذبات سوز و گداز اور بلند خیالی نظر آئے گی لیکن فیصلہ اکثریت پر ہوتا ہے

آج کی صحبت شعرائے لکھنؤ کی کہانی مجملاً سنا کر ختم کرتا ہوں۔ انشاء اللہ عنقریب اس موضوع پر اپنے افکار پریشاں کتابی صورت میں ہدیۂ قارئین کروں گا مضمون پایۂ تکمیل تک پہونچ چکا ہے اور یہ چند سطریں اسی کا اقتباس ہیں۔ ممکن ہے کہ رسالۂ کنول ہی میں اس کی تسلسل شایع ہوں۔ آج کی صحبت ختم ہو رہی ہے۔ دلّی کے کیا باشیوں کا نالہ تو سن چکے اب ذرا لکھنؤ کی رنگین محفلوں کی سیر کیجئے۔

مصحفی بے شبہہ اس دور کے شعرا میں سب سے زیادہ مہذب، نقد و متین ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں بھی ابتذال موجود ہے مثلاً ؎

جب تونے اجائی تھی دھڑی مسی کی کافر — واللہ اسی دن مرا ایمان گیا تھا

ستاروں نے ابھی پر اکھڑا پنی لگا دی ہیں — کلابتو کا ہے جو کام تیرے کفش پر جوٹا

حُسن کی آرایش ایسی بھی نہ تو آساں سمجھ — لاکھ نخرہ تو ٹیں جب اس کے کان کا بالا بنا

مراحی دار آنسو عاشقوں نے سپہ ٹانکے ہیں — نہیں یہ گھونگرو گوٹے کے دامن کی کناری میں

عشق اس ناف کا نہیں اچھا — ڈوبتی ہے بھنور میں جا کر ناؤ

آتش ؎

کسی کے محرم آبِ رواں کی یاد آئی — حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

ناسخ ؎

جلد رنگ لے دیدۂ خونبار اب تارِ نگاہ — ہے محرم اس کی سی بیکر کو ناڑا چاہئے

لب و لہجہ کا زنانہ پن ملاحظہ ہو:-

رند ؎

اور پری تجھکو خدا نے دی ہے صورت نور کی — تیری اڑی پر کیوں مٹتے ہیں تی حور کی

اب کی نوچندی میں آئے نہ زیارت کو اگر — علم حضرتِ عباس ہی کی مار پڑے

ابتذال و سخافت ملاحظہ ہو۔

آتش ؎

بوسہ بازی سو مری ہوتی ہے ایذا اُسکو — منہ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں مہاسے پیدا

لب شیریں کی تری چاشنی ممکن نہ ہوئی — اس سے شکر ہوئی اُسکرے بتلشے پیدا

ناسخ ؎

دیکھ کر تجھ کو نہ کیونکر نعرہ زن ہوں سب رقیب

بیشتر کتوں کا بھکوانا ہے جلوہ ماہ کا

ابتذال و امرد پرستی کی بدترین مثال ملاحظہ کیجئے۔

ناسخ ؎

استرہ منہ پہ جو پھر نہیں دیتا ہے بجا — مو دیندار سے کیونکر خطا قرآں ہوتا

مجھ سے ملوانا ہے اب لازم جنونِ نجبری — ادد کوہِ عشق کی کتنا ہے تو گدر اُٹھا

بالوں کا کچھ اثر بغلِ یار میں نہیں — پڑتا ہے عکس زلف سیہ فام دور تک

ایسے اشعار کسی شاعر کے قلم سے نہیں نکل سکتے:-

خلیل ؎

دیکھی شبِ وصل ناف اُس کی

روشن ہوئی چشم آرزو کی

جرأت ؎

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں

مت کر خدا کے واسطے سے ہے نہیں نہیں

کیا رک سکے وہ کہ ہے جو کہ اس سے لگ چلوں

بس بس ہٹے ہو شوخ یہ اچھی نہیں

امردوں کے جیسا شعار پاکیزہ ہیں۔

جرأت ؎

عالم ہے جوانی کا ابھرا ابھرا سینہ | کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات ہو واللہ
اس ابھرے ہوئے گات کی کیا بات جسے دیکھو | سب تاکتی ہیں
اور ہاتھ ہے ہر بات میں گردن کا وہ ڈورا | ہے دام محبت
ہیں مہر سر جیب گول وہ اور ہائے کہوں کیا | رازوں کی گدازی
فرق اس میں نہیں فرق سے لے تا بہ کف پا | ہے طرز لطافت
مہتاب ہو لگ چلنے کا جو میں نے کیا عزم | دے منہ کو وہ گالی
کچھ اور کیا قصد تو کس ناز سے بولا | بس بس تری جرأت

انشاءاللہ خاں ایسے باکمال قادر الکلام شاعر کو لکھنؤ نے خراب کر چھوڑا۔ ان کے مزخرفات ملاحظہ کیجیے:۔

انشا ؎

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا | جب دھم سے آ کہوں گا لیجیے سلام میرا
تعویذ لعل ہی کے نہ بھرے گھمنڈ پر | اک نیلا ڈورا باندھیو اس گوری کے ڈنڈ پر
یہ جو مست بیٹھی ہیں رادھا کے کنڈ پر | اوتار بیٹھے کرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر
راجہ جی ایک جوگی کے چیلے ہیں غش میں آپ | عاشق ہوئے ہیں واہ عجب ٹنڈ منڈ پر

آج یہ کہانی آتش کے چند اشعار پر ختم کر رہا ہوں انشاءاللہ کی صحبت میں لکھنؤ کی داستان رنگین تفصیل کیا سناؤں گا۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے کہ ان شعرا کے جمگھٹے میں ٹانکی کیسے شاعر ہیں۔ میرا خیال ہے فرق صرف یہ ہے کہ آتش شاعری کی صحت پر ٹکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مرزا غالب نے ایک بار دلی اور لکھنؤ کی شاعری کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ دلی کا مضمون اور لکھنؤ کی زبان مستند ہے اور اس کے ثبوت میں بحر کا یہ مصرع پڑھا تھا

نہاتا ہے وہ رود دریا میں کپڑے جو دھوتی ہے

صبا رشیدی ایم۔ اے

جو کھوئے سو پائے
(گیت)

پاپی من ہے تھکا مسافر رستہ کون بتائے | خود ہی دوڑے، خود ہی بھٹکے، خود ہی ٹھوکر کھائے
پی نہیں آئے من ترپت ہے جیون بیتا جائے | جیسے بنا کھویا کوئی ناؤ جھکولے کھائے
کب تک سکھ چین ملا ہم کو جب تیاگ چکو سکھ چین | پیت کی ریت نرالی سب سے جو کھوئے سو پائے
دکھیا دل ہے ایک سمندر، نین بھادوں نیر | جیسے برکھا رت کا بادل برسے اور کھل جائے
رین اندھیری، ڈگر کٹھن ہے پریم نگر تک جانا | نین جگت ہیں من سوتا ہے، من کو کون جگائے

ان پر تن من وار چکے کیا حال ہے اب مت پوچھ
جیسے کوئی پاپ کرے، پھر روئے اور پچھتائے

شاہد صدیقی اکبرآبادی

منحوس نگینہ

میں شام کے وقت اپنے دوست فیروز کے مکان پر مدعو تھا — ایک وسیع کمرے میں بیٹھ کر ہم دونوں نے تیسرے پہر کا ناشتہ کیا۔ یہ کمرہ پُرانے زمانہ کے نقرئی اور طلائی سامان سے آراستہ تھا۔ وہ رنجیدہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ لیکن اس پر ایک خود فراموشی سی طاری تھی۔ کبھی کبھی اُس کے اندازِ گفتگو سے زندہ دلی خوش طبعی اور فراست مترشح ہونے لگتی تھی۔ اتفاقیہ طور پر اُس کی زبان سے ایسے الفاظ بھی نکل جاتے تھے؛ جن سے یا تو صنعت گری کے ذوقِ لطیف اور یا پھر شکار کے شوقِ بیحد کا اندازہ ہوتا تھا۔ شکار کا وہ اسقدر دلدادہ تھا کہ ایکبار گھوڑے سے گر کر سر میں مہلک زخم آجانے کے باوجود بھی اُسے ترک نہ کر سکا۔ اس کا سلسلۂ خیالات بار بار منقطع ہوجاتا تھا جیسے کوئی چیز اس کے خیالات کے راستہ میں حائل ہو رہی ہو۔

اس کی تمام گفتگو میں سے جس کے سمجھنے کے لئے دماغ پر زور ڈالنا پڑتا تھا۔ مجھے صرف اس قدر یاد ہے کہ اُس نے سفید مور کا ایک جوڑا وطن بھیجا تھا۔ اور یہ کہ بلا کسی خاص وجہ کے گذشتہ تین ہفتے سے اپنے دوستوں سے ملنا جُلنا بند کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ اس درمیان میں اپنے عزیز ترین دوست منوہر اور اس کی بیوی کیسر سے بھی نہیں ملا تھا۔

یہ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اُس نے مجھے اس راز میں شریک کرنے کے لئے نہیں بلایا تھا کہ وہ اتنے عرصے تک گوشہ نشین کیوں رہا۔ چائے پینے کے وقت میں نے اس سے دریافت کیا: تم مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے؟ اُس نے کسی قدر متحیر نگاہوں سے مجھے دیکھ کر کہا:

"کیا مجھ سے کچھ کہنا تھا؟"

"تم نے لکھا تھا کچھ گفتگو کرنا ہے، کل شام کو چائے میرے ہی ساتھ پیو۔"

وہ ابھی خاموش ہی تھا کہ میں نے اپنی جیب سے اُس کا بھیجا ہوا خط نکال کر اس کے سامنے رکھدیا۔ لفافہ اُسی کے شکستہ گرد کش خط میں لکھا ہوا تھا جو کہ نہ بیقاعدہ معلوم ہوتا تھا۔ اور مہر کی لاکھ بنفشئی رنگ کی تھی۔ اُس نے پیشانی پر ہاتھ پھیر کر کہا:

مجھے یاد آگیا۔ . . . . تم ذرا مہربانی کرو اور فرامرز کے پاس چلے جاؤ وہ تمہیں رومنی کتب خانہ دکھائے گا۔ رومنی ایک جوان عورت ہے۔ بھورا سے کالے بالوں کی تابش اُس کے رخسار اور پیشانی پر سایہ کئے رہتی ہے اور چلکی سیاہ پتلیاں نیند کے خمار میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہیں . . . . حسین اور رنگین چہرے کی رونق و تازگی اور لطافت نہایت دلفریب ہے اُسکے ہاتھ . . سڈول، نرم، چکنے اور خوبصورت ہیں۔ بہرحال تم [illegible]

اور اگر......"

اُس نے کسی قدر پس و پیش کرنے کے بعد دروازہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا:-

"ذرا ٹھہرو، کوٹ پہن لوں۔ میں بھی ساتھ چلتا ہوں"؛ میں کمرے میں تنہا رہ گیا۔ کھڑکی کے قریب جاکر میں نے پہلے سے زیادہ غور کیا تھا بنفشئی رنگ کی مُہر کا معائنہ کیا۔ مُہر کا طرز قدیم زمانہ کی یاد دلاتا تھا!

ایک دیوتا کسی دیوی کے چہرے سے آنچل سرکا رہا تھا دیوی برگد کے درخت کے نیچے خواب ناز میں محو تھی۔ ایسے نقوش زمانۂ قدیم کے تیرہویں عہد میں جواہر کے نقاشوں۔ مصوروں کو پسند تھے۔ وضع کی صفائی، نقش و نگار کا تاثر اور پس منظر کی ہم آہنگی و مناسبت نے اُس تصویر کو جو ایک سر انگشت سے زیادہ نہ تھی نہایت وسیع اور دل آویز بنا دیا تھا۔

تصویر کی سحرکاریوں کا اثر ابھی میرے دل سے زائل نہ ہوا تھا کہ میرا دوست کمرے کے نیم وا دروازے سے نمودار ہوا۔

"آؤ چلیں" اُس نے کہا۔

اُس کی صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے باہر جانے کی بہت جلدی ہے میں نے اپنے دوست کو ایسی عجیب مُہر کا مالک ہونے پر مبارکباد دی اور اپنی دلی خوشی کا اظہار کیا

"مجھے اس کی خبر نہ تھی کہ تم اسقدر خوبصورت نگینے کے مالک ہو"

اُس نے جواب میں بتایا کہ اس نگینہ کو اُس کے قبضے میں آئے ہوئے زیادہ مدت نہیں گذری تھی، صرف چھ مہینے ہوئے کہ اُس نے وہ نگ پڑا پایا تھا۔ پھر اُس نے انگوٹھی کہ جس میں وہ نگینہ جڑا ہوا تھا اپنی انگلی سے اتار کر مجھے دکھایا۔

یہ مشہور بات ہے کہ ایں قدر عمدہ وضع کے نقش کئے ہوئے پتھر بالعموم عقیق ہوتے ہیں۔ میں اس انگوٹھی کے گہرے بنفشئی رنگ کے بے آب نگینے کو دیکھ کر کسی قدر متحیر ہوا۔

"کیا؟ نیلم!" میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں ایک پتھر، ایک مغموم، افسردہ اور منحوس سا پتھر! کیا خیال ہے؟ کیا سچ مچ یہ ایک پرانا نگینہ ہے؟"

اُس نے خوردبین منگائی۔ میں اُس نگینے کے نقوش کی بہتر طریقے سے جانچ کرنے لگا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ قدیم ہندوستانی نقاشی کا ایک شاہکار ہے۔ جس کی تاریخ ابتدائی دور تہذیب سے شروع ہوتی ہے عجائب خانۂ عالم میں اس سے زیادہ خوبصورت نگینہ میری نظر سے نہیں گذرا تھا۔ خوردبین کی مدد سے میں نے دیکھا کہ نگینے پر ایک ایسا نقش بنا ہے جو زمانہ قدیم کی ایسی یادگاروں پر منقوش کیا جاتا تھا جو تحفہ اور یادگار کے طور پر دیجاتی تھیں میں نے اپنے دوست کو بھی اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی

وہ اپنے شانوں کو جنبش دے کر مسکرایا۔ انگوٹھی کے نیچے کا حصہ جس پر نگینہ جڑا تھا کھلا ہوا تھا میرے دل میں اُسے اُلٹ کر دیکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ میں یہ دیکھکر متحیر ہوا کہ اس پر کندہ کی ہوئی عبارت، بے ڈھنگی اور بدخط تھی جو نگینہ سے کم پرانی نہ تھی۔ ایک لحاظ سے وہ علامات اُن نقوش سے مشابہ تھے جو زمانۂ قدیم میں اُس فرقے کے عہد کے پتھروں پر پائے جاتے ہیں جس نے مذہب کو صرف جانوروں کی قربانی اور ریبینٹ میں محدود کر دیا تھا اور جس سے ماہرینِ آثارِ قدیمہ بخوبی واقف ہیں۔ فیروز کو میری اس رائے سے اتفاق تھا۔

"خیال یہ ہے کہ" اُس نے کہا "یہ کوئی پُراسرار نقش ہے۔ کسی شاعر کے کلام سے اخذ کی ہوئی کوئی بددعا معلوم ہوتی ہے۔"

"کون شاعر؟"

"مجھے اس معاملے میں زیادہ واقفیت نہیں ہے؟"
خوردبین کی مدد سے دو حروف کا مجموعہ صاف نظر آتا تھا۔

केरी

"ان حروف سے کوئی نام مرتب نہیں ہوتا" فیروز نے کہا۔

میں نے فیروز سے کہا ہندی زبان میں یہ حروف مندرجہ ذیل حروف کے مرادف ہیں :-

"کیری"

میں نے وہ نگینہ واپس کر دیا۔ پھر اُس نے انگوٹھی کو چند بار دیکھا اور پھر پہن لیا۔

"آؤ چلیں" اُس نے تیزی سے کہا۔

"کہاں کا قصد ہے"

"فرامرز کے مکان کا، مگر تم؟"

"میں؟ میں کہاں جاؤں گا؟"

"مجھے مسٹر ہربر کے مکان پر ایک گھوڑا دیکھنے جانا ہے، کیونکہ جبتک اُسے میں نہ دیکھ لوں وہ نہ خریدے گا۔ آپ واقف ہی ہیں کہ میں گھوڑوں کے معاملہ میں ایک ماہر کی حیثیت رکھتا ہوں۔ جانوروں کا علاج بھی کر لیتا ہوں۔ میں فرنیچر وغیرہ کی ایجنٹی بھی کرتا ہوں اور فرش فروش کی سوداگری بھی۔ فنِ عمارت و باغبانی میں خاص مہارت رکھتا ہوں اور ضرورت کے وقت سرکاری ہنڈیوں کا لین دین بھی کر لیتا ہوں۔ افسوس! دوست میرا بس ہو تو میں تمام سودخوار ساہوکاروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں"

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے بہت دور نکل آئے۔ اب میرے دوست نے کچھ اس رفتار سے چلنا شروع کیا جو اُس کی خلقی متانت کے بالکل خلاف تھا۔ اُس کے قدم یکایک اسقدر تیز ہو گئے کہ میں بڑی مشکل سے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ ایک خوش پوش [illegible] سے گذری فیروز نے مجھے اشارہ کیا۔

"اُس کی پیٹھ مدور اور جسم بھاری ہے، لیکن اُس کی پنڈلیاں کس قدر سڈول اور کتنی جاذبِ نگاہ ہیں۔ اُس کے ٹخنے دیکھو تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ گھوڑے، عورت اور تمام نازک جانوروں کے جسم کی ساخت میں کس قدر مطابقت ہے یعنی گوشت والے حصے تو چوڑے اور بھاری ہوتے ہیں لیکن جوڑوں کے پاس جہاں ہڈی کا حسن نمایاں ہوتا ہے، اعضا پتلے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً عورت کو دیکھئے اُس کا اوپر کا دھڑ نظر فریب نہیں ہے لیکن اُس کے ہاتھ پاؤں کس قدر چست اور قوی ہیں! اُس کے قدم کس قدر جچے ہوئے پڑتے ہیں اور ٹھیک ٹخنوں کے اوپر اُس کے پاؤں کس قدر حسین ہوتے ہیں! پنڈلیاں کیسی بھری ہوئی سڈول اور کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں!"

پھر اُس غیر فطری اور مصنوعی دانشمندی کے ساتھ جس کے جتانے کے لئے وہ ہمیشہ طیار رہتا تھا اُس نے کہا :-

"ایک ہی عورت میں تمام خوبیوں کی توقع نہ رکھنا چاہئے بلکہ جہاں اور جتنا حُسن ملے اُس سے لطف اندوز ہونا چاہئے۔ حُسن دنیا میں نہایت کمیاب شے ہے"

اس کے بعد کسی پُر اسرار خیال میں محو ہو کر اُس نے اپنا بایاں ہاتھ اُٹھایا اور نگینہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اُس سے کہا۔

"کیا تم نے ایک عالی خاندان خوبصورت لڑکی سرو چکاری کو چھوڑ کر اس طرفہ اور شراب کی حریص عورت کو اپنی شریکِ زندگی بنانے کے لئے منتخب کیا ہے؟"

"اُف، ہاں! ایک حسین لڑکی ...... [illegible] خوبصورت و نازک شاخ ......"

[illegible] کے بعد وہ ایک انقلابی جماعت میں شامل [illegible] ایک چھوٹی سی ریاست علیحدہ قائم کرلی جس کی وجہ سے آج [illegible] لٹیروں کے علاقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہوں [illegible] ملک کی دوستی کا فخر اور ایک رئیس کا مرتبہ حاصل ہے۔ میں نے [illegible] کو کیوں چھوڑا؟ کیوں؟ وہ جو سیتا سپاری کے درخت سے زیادہ تھی اس کو میں نے ایک حریص مینوشی ایک برگد کے درخت، ایک منحوس [illegible] سے بدل لیا ہے"

یہ الفاظ طنزیہ لب لہجہ میں ادا ہوئے۔ ہم دونوں فرامرز کے مکان تک پہنچ گئے؛ لیکن فیروز آگے بڑھتا چلا گیا۔

"میرا خیال تھا تم فرامرز سے ملنا چاہتے تھے"

شاید فیروز نے میری بات نہیں سُنی اور رفتار تیز کردی۔ وہ یکایک ایک بلند و بے رونق مکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور خاموشی کے ساتھ اس دیوار پر متجسسانہ نظر ڈالی جس میں سنور کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔

"کیا تم یہاں دیر تک ٹھہرو گے؟" میں نے دریافت کیا۔ "کیا تم جانتے ہو اس مکان میں کیری بائی سکونت پذیر ہے؟"

میرا خیال تھا کہ یہ نام اُس کو متنفر کرے گا۔ "کیری" ایک ایسی عورت تھی جس کے مصنوعی حسن سے میرا دوست متنفر تھا۔ اس کے متعلق عام شہرت تھی کہ وہ حد درجہ زر پرست عورت ہے اور ساتھ ہی بیوقوف بھی اُس کے چہرے سے جوانی رخصت ہو چکی تھی وہ ایک مشتبہ عورت [illegible] اُس کی نسبت خیال کیا جاتا تھا کہ وہ خریداری کے حیلے سے [illegible] سے سامان چُرا لیتی ہے۔ میرے دوست نے کمزور اور محزون [illegible] جواب دیا: "کیا تمہارا خیال ہے کیری بائی اسی مکان میں رہتی ہے؟" [illegible] دوسری منزل کی کھڑکیوں اور اُن میں تاک [illegible] ٹھہر رہی ہے"

"کیری بائی۔ یقیناً یہیں رہتی ہے۔ اس وقت بھی وہ غالباً اُنہیں سُرخ شیشوں میں سے کسی زنگی شیشے کے پیچھے کھڑی ہوگی"

اُس کی صورت سے ظاہر تھا کہ وہ "کیری بائی" کو آواز دینا چاہتا ہے میں نے اپنی حیرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"کسی زمانے میں "کیری بائی" آپ کے لئے ناقابلِ برداشت تھی یہ وہ زمانہ تھا جب ہر شخص اُس کی خوبصورتی اور زیبائی کا قائل تھا اس کا حُسن دلوں میں مہلک جذبات اور رجانستاں محسوسات پیدا کردیتا تھا اس زمانہ میں تم کیا کرتے تھے: اگر اُس کا سینہ ہموار اور اعضا کے جوڑ کشادہ نہ ہوتے تو اُس کا موٹا چمڑا اس کی طرف سے میرے دل میں ایسی نفرت پیدا کر دیتا۔ جس کا دُور ہونا دشوار تھا۔ اب جبکہ اُس کی بہارِ حُسن مائل بخزاں ہو رہی ہے کیا تمہیں کیری بائی میں حُسن کی کوئی ایسی جھلک نظر آ گئی ہے جس کی نسبت تم کچھ دیر قبل کہہ رہے تھے کہ ہمیں اسی پر اکتفا کرنا چاہئے؟ نہیں اُس کے ٹخنوں کی نزاکت اور اُس کے دل کی نرمی میں آخر کیا بات نظر آئی ہے؟ ایک ایسی دراز قامت اور بے ڈول عورت جس کے جسم کے بالائی حصے میں کوئی حُسن نہیں پایا جاتا، جس وقت اپنے ملاقات کے کمرے میں داخل ہو کر چاروں طرف ایک غلط انداز نگاہ ڈالتی ہے تو محض اُس ایک ادائے سادہ کی وجہ سے، ان تمام خود پسند و بزدل اشخاص کے قلب اُس کی طرف کھینچنے لگتے ہیں جو اپنے آپ کو ایک فطری دلکشی سے محروم عورت کے حوالے کر کے تباہ ہوتے ہیں۔

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ　　کیا جانئے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

——— ایک عورت کی نسبت اس قسم کے خیالات کا اظہار کرنے میں مجھے تامل بلکہ شرم معلوم ہوئی؛ لیکن اس عورت نے اکراہ پیدا کرنے والی حرکات کا اتنا بڑا ثبوت دیا تھا کہ میں اس نفرت کو ضبط نہ

کرسکا۔ جو اس کی طرف سے میرے دل میں جاگزیں ہو چکی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں کبھی ایسے خیالات کا اظہار نہ کرتا اگر مجھ کو اس کی عیاری و بدخلقی کا پورا پورا یقین نہ ہو چکا ہوتا۔ مزید برآں مجھے کامل اطمینان تھا کہ فیروز نے میری تقریر کا ایک حرف بھی نہیں سُنا

اُس نے اس طرح گفتگو کی گویا وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے :۔

"اُس کو آوازہ دیوانہ دینا برابر ہے۔ چھ ہفتوں سے یہی کہیں گیا اور اُس سے ملا اب میں ایسے ایسے دروازے جھانکتا پھرتا ہوں جنھیں سالہا سال سے داخل ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ مجھے اُن گھروں میں بھی داخل ہونا پڑا ہے جہاں میرے قدم اس سے پہلے نہیں گئے تھے اور جو میرے لئے بالکل اجنبی ہیں۔ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟ اس کا سبب مجھے نہیں معلوم!"

مجھے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کون سا طلسم غریب تھا جو فیروز کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بالآخر میں اُسے ایک کھلے ہوئے دروازے کے آگے کھڑا چھوڑ کر چلا آیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ شخص جو کیری بائی سے اُسوقت گریز کرتا تھا جب وہ خوبصورت تھی، وہ شخص جس نے اُس کی محبت اس وقت ٹھکرا دی تھی جب وہ اپنی جوانی کی رسیدگی کے دور میں تھی اب جبکہ اس کی عمر ڈھل چکی اور وہ تفکرات کا شکار ہو رہی ہے، اُسے حاصل کرنے میں کوشاں ہے۔ یہ سب اُس ذہنی اختلاط کا نتیجہ ہے جس کو میں کم سے کم اپنے دوست میں دیکھنا نہ چاہتا تھا میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس عالم میں جس کی امداد سے ہوس پرستی کا مرض تشخیص ہو سکتا ہے۔ ایسے غیر معمولی ذوق و شوق کی مثال دستیاب ہونا محال ہے۔

ایک ہفتے کے بعد میں پونا سے روانہ ہو گیا اور کوئی امید نہ تھی کہ فیروز سے مجھے ملاقات کا موقع پھر میسر آ سکیگا۔

لیکن کچھ دنوں بعد مجھے اپنی بہن سے ملنے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے خلاف اُمید کیری بائی کو دیکھا۔ وہ تن تنہا بدحالی اور [illegible] حالت میں ساحل کی طرف جارہی تھی۔ پاؤں گھسیٹ [illegible] کرتا تھا کہ اُس کا جوتا ایڑی کے پاس سے [illegible] ہوا ہے۔ اُس کی ساڑی [illegible] اور ماند رنگ کی تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لئے کھڑی ہو گئی اور [illegible] دیکھنے لگی۔ اُس کی بے رونق آنکھوں کے حلقوں اور لٹکے ہوئے ہونٹوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ وہ اداس اور افسردہ آگے بڑھ گئی۔

اس بیکس غریب عورت کو اسوقت جوں کا نشانہ تھا [illegible] سڑک کی موڑ پر ایک بساطی کی دوکان پر کھڑی ہو گئی لمبی پتلی دراز دُبلے ہاتھ ایک میں کو دیکھنے لگی اسوقت [illegible] ہوئی نظروں نے اس افواہ کی یاد تازہ کردی جو عام طور پر اُس کی نسبت مشہور تھی۔ دوکاندار کسی خریدار کو سامان دکھاتا ہوا اُس طرف آنکلا اور کیری بائی، بس رکھ کر ساحل کی طرف اپنی اُسی آہستہ رفتار سے روانہ ہو گئی

مجھے بھی اس دوکان سے کچھ سامان خریدنا تھا۔ جب میرا خریدا ہوا سامان باندھا جا رہا تھا۔ دوکان کی کھڑکی سے میں نے فیروز کو ساحل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے چہرے سے فکر کے آثار نمایاں تھے۔ وہ نہایت تیزی کے ساتھ جا رہا تھا۔ اور محو خیال و تصور میں دانتوں سے ناخن کترتا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے میں دیکھ سکا کہ وہ نیلم کی انگوٹھی پہنے ہوئے ہے۔ میں نے دوکاندار سے دریافت کیا کہ آپ فیروز سے واقف ہیں۔ اُس نے سر ہلایا اور پھر کسی قدر پریشان ہو کر کہا:

"فیروز سادہ لوح اور نہایت معمل آدمی ہے۔ وہ اس عورت کے پنجے میں گرفتار ہے۔ اور سچ تو یہ ہے ....؟

اُس نے سانس لینے کے بعد کہا۔

"وہ خود ہی اُس عورت کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

فیروز واقعی اُس کا سایہ بن گیا تھا جس [illegible]
[illegible] مجھے [illegible] نے [illegible] کیری [illegible]

... تھا کہ کیری بائی کا خاوند ایک ایسا شخص تھا جس کی نسبت یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ وہ بیوقوف ہے یا زن مرید۔ اس کی کاہل طبیعت نے اُسے ان دونوں الزاموں سے بری ثابت کر دیتی تھی اور اس بنا پر وہ اس امر کا مستحق تھا کہ شک کا فائدہ اُسے دیا جائے۔ میں فیروز کی ذہنیت میں شدید انقلاب دیکھ کر سخت متحیر ہو لیا تو وہ زمانہ تھا کہ کیری بائی اُسے اپنے حُسن پر فریفتہ ہونے کی ترغیب دیتی تھی اور وہ اُس سے بھاگتا تھا اور لطف یہ کہ فیروز نے اپنی دلی نفرت اور ناپسندیدگی کے پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ اُس کے مُنہ پر کہہ دیا کرتا تھا: "ایک مصنوعی حُسن والی عورت بدصورت عورت سے زیادہ ناقص کریہہ منظر ہوتی ہے بدصورتی خوشگوار ثابت ہو سکتی ہے، لیکن مصنوعی حُسن بیہودگی کے میل سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔" اس وقت فیروز کے جذبات زیادہ قوی ہو جاتے تھے جس کے اظہار میں اُس کا طرز بیان مذہبی عظمت اختیار کر لیتا تھا۔ اب یہ حال تھا کہ کیری بائی اس کی تمام التفات ہیں کی اور فیروز ہے کہ اُسی کا ہو گیا ہے حقیقت یہ تھی کہ کیری بائی مریلو کی فرصت پیدا ہو چکی تھی اس کی تمام تر توجہ انیوٹ لراینی ایک ہمجولی کیتھرائن جس کی معصوم دوستی کی بنا پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ دونوں خطرناک حد تک نشہ کرتی ہیں ان دونوں عورتوں کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ناممکن تھا تاہم جب وہ دونوں باہر نکلتیں تو فیروز سایہ کی طرح اُن کے ساتھ ضرور ہوتا۔ ایک روز میں نے فیروز کو دیکھا کہ کیری بائی کے خاوند کی دوربین کاندھے پر لٹکائے ہوئے جا رہا ہے۔ ساحل پر پہنچ کر فیروز نے "کیری بائی" کو کشتی پر بیٹھ کر ہوا خوری کی ترغیب دی۔ یہ بالکل فطری بات تھی کہ میں نے اپنے مغموم دوست کو جو خود بھی ہر وقت نشہ اور غنودگی کے عالم میں رہا کرتا تھا اس بدتمیز کن وضع میں دیکھ کر اُس سے ملنے کی خواہش ... بغیر ملاقات کئے ہوئے بمبئی روانہ ہو گیا اور اُسے ... اس کی ... کا تماشہ دیکھنے کے لئے وہیں چھوڑ دیا۔

ایک شام کو ہم دونوں پھر پونہ میں ملے یہ ملاقات اُس کے دوست اور ہمسایہ منوہر کے مکان پر ہوئی۔ خوبصورت مکان کی سجاوٹ اور اُس کے سامان کی ترتیب سے مجھے منوہر کی بیوی کیسر اور اپنے دوست فیروز کی خوش ذوقی کا اندازہ ہوا۔ ان دونوں کے متحدہ ذوق نے مکان میں عجیب خوبصورتی اور دلکشی پیدا کر دی تھی۔ سامان آرائش میں درجہ کی ہم آہنگی اور مناسبت پائی جاتی تھی۔ مکان میں زیادہ آدمی نہ تھے صرف چند احباب اس وقت موجود تھے

فیروز میں ہی پہلی سی ذکاوت جو اُس کے لئے مخصوص تھی اور جس کی لطافت میں خفیف سنگدلی کی تلخ حلاوت پائی جاتی تھی از سر نو عود کر آئی تھی۔

کیسر ایک ذہین عورت تھی اُس کی تقریر نہایت شیریں ہوتی تھی جس وقت میں کمرے میں داخل ہوا ہوں بالکل معمولی گفتگو اور معمولی حالات پر تبصرہ ہو رہا تھا ایک مجسٹریٹ پولیس کی ایک چوکی کے متعلق ایک مشہور عام واقعہ بیان کر رہا تھا جس میں ہر پہرے والا جو یکے بعد دیگرے تعینات کیا جاتا تھا خودکشی کر لیتا تھا اور جو محض اس بنا پر مسمار کر دی گئی تھی کہ پہرے والے اس عجیب متعدی بلا سے آئندہ کے لئے محفوظ ہو جائیں۔ کیسر نے مجھ سے دریافت کیا کہ آیا میں توہم پرست ہوں یا نہیں؟ میں ابھی جواب کے لئے الفاظ ہی ڈھونڈھ رہا تھا کہ مجسٹریٹ کے جواب نے مجھے فکر جواب سے آزاد کر دیا۔ اُس نے کہا میں توہمات کا منکر ہونے کے باوجود توہم پرستی میں مبتلا ہو گیا ہوں۔

"آپ صحیح فرماتے ہیں" کیسر نے جواب دیا: "یہ حضرات نہ خدا کے قائل ہیں نہ شیطان کے لیکن قدیم رسم و روایات کے بیحد معتقد ہیں"

کیسر گفتگو کر رہی تھی اور میں اُس کے حُسن فسوں ساز کے نظارے میں محو تھا۔ اُس کے سُرخ رخسار، مینائی گردن اور گداز شانوں کی

رحُسن سے میں سخت متاثر تھا۔ اُس کے اعضاء کا تناسب اور جسم کی
نے ایک نادر بے بہا حُسن کا مجسمہ میرے پیشِ نظر کر دیا تھا۔ میں نے
ر کیسر کے بارے کے متعلق نہیں معلوم فیروز کا کیا خیال ہے۔ میرے
ہ حد درجہ خوبصورت تھی۔

وز نے آکر مجھ سے ہاتھ ملایا میں نے دیکھا کہ اس کی انگلی میں وہ
تھی۔

یہ نے اپنی انگوٹھی کیا کی؟"

کھو گئی!"

وہ انگوٹھی وہ عجیب اور قدیم انگوٹھی تم نے کھو دی۔ جو ایک
در چیز تھی؟"

وز نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اُس کے دوست منوہر نے جو ہمیشہ
رفاداری میں کمربستہ رہتا تھا جواب دیا:۔

ں یہ ایک عجیب واقعہ ہے وہ انگوٹھی کھو گئی۔"

ہر ایک دلچسپ، نہایت خود اعتماد اور کسی قدر لسّان آدمی تھا۔
سادہ لوحی بعض اوقات مضحکہ خیز ہو جاتی تھی۔ اُس نے کیسر کی طرف
ہو کر کہا:

ماں ایک صاحب تشریف رکھتے ہیں جنھوں نے ابتک نہیں سُنا کہ ہمارے
نے اپنی انگوٹھی کھو دی؟"

پھر میری طرف متوجہ ہو کر:

آپ کو نہیں معلوم یہ تو ایک مشہور واقعہ ہے۔ آپ یقین کیجئے۔ فیروز نے
چھوڑ دیا تھا۔ میں کیسر سے کہا کرتا تھا: کیا تم نے اُسے ناراض کر دیا ہے؟
ب دیتی کہ میں انھیں کیوں ناراض کرتی! آخر کوئی وجہ؟ ترک ملاقات
وجہ ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ ہماری حیرت میں اُس وقت اور اضافہ
ہم نے یہ سنا کہ وہ کیرتی بائی کے ساتھ ساتھ سایہ کی طرح پھرتا ہے:

کیسر نے اپنے خاوند کا قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

"اس واقعہ کا انگوٹھی کھونے سے تعلق ہی کیا ہے؟"

منوہر نے زود رنج ہو کر کہا:

"مجھے معاف کرو۔ انگوٹھی کی تاریخ بیان کرنے کے لئے اس کا ذکر
نا گزیر ہے۔ ہاں تو اس مرتبہ گرمی کے موسم میں فیروز نے ہمارے
ساتھ ہمارے گاؤں جانے سے انکار کر دیا جو خلافِ معمول تھا۔ میں اور
میری بیوی نے اُسے نہایت شوق کے ساتھ دعوت دی تھی لیکن
اُس نے کیرتی بائی کی بے لطف صحبت چھوڑ کر بمبئی سے باہر قدم
نکالنا نہ چاہا۔

کیسر نے "بے لطف" کے استعمال پر ٹوکا۔

"کیا جھوٹ ہے؟" منوہر نے مکرر کہا:

"بالکل بے لطف صحبت وہ کیرتی بائی کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر
تفریح کرنے میں اپنا وقت ضائع کرتا رہا ہے۔"

فیروز نے آہستہ سے کہا کہ منوہر نے جو کچھ کہا اُس میں ایک حرف
صحیح نہیں ہے منوہر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب میں کہا:

"میرے دوست میں آپکو اجازت دیتا ہوں کہ آپ میری تردید کریں۔"
"فیروز کیرتی بائی یا اُس کی روح کے ساتھ رات دن پھرتا رہا۔ "روح"
میں نے اس لئے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ "کیرتی بائی" اب وہ کیرتی بائی نہیں
رہی جو پہلے تھی۔ یہ اس کی روح ہے جو چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ کیرتی بائی
کا خاوند اپنی دوربین لئے ساحل پر کھڑا رہتا تھا۔ فیروز نے انھیں بہا
خوابوں میں اپنی انگوٹھی کھو دی۔ اس حادثے کے بعد اس نے ایک دن
بھی بمبئی میں رہنا پسند نہیں کیا۔ وہ کسی شخص سے بھی نہ ملا اور
بلا رخصت ہوئے ریل پر سوار ہو گیا۔ اور اس وقت جب کہ ہم
نے اُس کا انتظار بھی ترک کر دیا تھا چھ دن کے

"میں آگیا ہوں!"

"اور انگوٹھی؟" میں نے ہاتھ میں انگوٹھی نہ دیکھکر دریافت کیا۔

"یعنی انگوٹھی دراصل" فیروز نے جواب دیا۔

"وہ سمندر میں گر گئی۔ وہ شاید اس کی ریت میں دفن ہو گئی" اور قدیم روایات کے مطابق کوئی مچھیرا بھی ایسی مچھلی پکڑ کر نہ لایا جس کے پیٹ سے وہ انگوٹھی نکل آئی"۔

کچھ دنوں بعد میں حسب معمول ایک دوکان دار کے پاس گیا جو پُرانی نادر اشیا کی تجارت کرتا تھا۔ میں نے اُس سے دریافت کیا کہ میری پسند و مذاق کی بھی کوئی چیز آپ کے پاس ہے؟ وہ جانتا تھا کہ مجھے پُرانی اشیا جمع کرنے کا خبط ہے۔ میں اسدرجہ کا قدامت پسند ہوں کہ پُرانے کانسے اور سنگ مرمر کے ٹکڑے بھی خرید کر رکھ لیتا ہوں اُس نے خاموشی سے شیشہ کا ڈبہ جو اعلیٰ مذاق کے لوگوں کے لئے مخصوص تھا کھولا اور ایک چھوٹا مرتبع نکال کر میرے حوالے کیا۔ یہ مرتبع عہد قدیم کی صناعی کا ایک بیش بہا اور اعلیٰ نمونہ تھا۔ جب میں نے اُس کی قیمت سُنی تو فوراً واپس کر دیا۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ مجھے پسند نہ تھا۔ میری نظر ڈبے [...] ایک نقش پر پڑی جو ٹھیک ویسا اُس انگوٹھی سے منقوش کیا گیا [...] میں نے فیروز کے پاس دیکھکر بے حد پسند کیا تھا۔ میں اُس دیوی اور درخت کو اچھی طرح پہچانتا تھا اور اس لئے شک و شبہ کا کوئی امکان ہی نہ [...]

"کیا کبھی یہ قیمتی مُہر آپ کے قبضے میں رہی ہے؟" میں نے دوکاندار [سے] دریافت کیا۔

ہاں میں نے اُسے پچھلے سال فروخت کر دیا"

"کتنی اچھی مُہر تھی وہ تمہیں کہاں سے دستیاب ہوئی تھی؟"

"مجھے ایک خزانچی کے اکٹھے کئے ہوئے نوادر میں ملی تھی پانچ [...] اس شخص نے ایک عورت کے پیچھے خودکشی کر لی۔ ... اُس عورت [...] ... شاید تم واقف ہو ... کیری آبائی ہے"

اُسوقت مجھے معلوم ہوا کہ میرے دوست پر جنونِ محبت کا دورہ [...] کی بدولت تھا اُس منقوش نگینے کی تاثیر تھی جو اُسے کیری [کے] پیچھے لئے پھرتی تھی۔

(ماخوذ از فرانس) دریا انصاری

ایک منظر

بام و در خامشی کے بوجھ سے چور
آسمانوں سے جُھکے درد رواں
چاند کا دُکھ بھرا فسانۂ نور
شاہراؤں کی خاک میں غلطاں

خوابگاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لَے ربابِ ہستی کی
ہلکے ہلکے سُروں میں نوحہ کناں

فیض ایم

انشائے لطیف پر ایک طائرانہ نگاہ

نشائے لطیف" پر تبصرہ کرتے وقت خیالات کی رو میں میری مثال اس شکاری کی سی ہوگئی جس کا نشانہ شکار کی کثرت میں کھو جائے۔ وہ ایک ایسا شگفتہ
میں جوانی اور سرمستی کی ڈھلتی پھرتی چھاؤں بند کر کے رکھدی گئی ہے، حسیات و وجدانیات اکثر لطیف حسیات، جو قطعاً ناقابلِ بیان
قوت سے باہر ہیں کس طرح الفاظ میں قید کر دیئے گئے ہیں، محبت کا کوئی کھیل ایسا نہیں ہے جو اس میں نہ کھیلا گیا ہو، دلچسپ سے دلچسپ اور
سے خطرناک، حسن کا کوئی انداز ایسا نہیں جو اس میں نہ دکھایا گیا ہو، شیریں سے شیریں اور قاتل سے قاتل، اگر اس کے حسین و جمیل فقرے
کئے جائیں تو ساری کتاب انتخاب میں آجائے مختصراً یوں سمجھئے کہ اگر شاعروں کے بہترین اشعار، مصوروں کے بہترین شاہکار فلسفۂ جمالیات
ترین نظریات جمع کردیئے جائیں تو اس کا نام ہوگا "انشائے لطیف" "جمالی" نامی کردار کو جس کامیاب طریق پر نبایا گیا ہے۔ اس طریق پر
اب ادیب صرف اپنے ہی متعلق لکھ سکتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کتاب کو الہامی کہنا اس کی زبان سے جو تمام کائنات کو الہام سمجھتا ہو، کوئی امتیاز ظاہر نہیں کر سکتا، تاہم میرے رائے میں ہر وہ تحریر
جانے کی مستحق ہے جس کو دیکھکر مستند ادیب اپنا عجز محسوس کریں بلکہ خود مصنف بھی، کیونکہ تجلیات کر رہیں ہو نہیں اور کلام بھی ایک تجلی ہے، وہ تجلی
نات ہے جو "کن" کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی، وہ تجلی جو خاتم کائنات ہے جو "صور" کی شکل میں نمودار ہوگی، دنیا، عقبیٰ، بندہ، مولا،
لفظ ہیں، ایک نغمہ، ایک ترانہ۔

شائے لطیف، کو پڑھ کر آپکو معلوم ہوگا کہ نثر کس قدر فطری کتنی حسین اور کتنی دلکش چیز ہے، نظم کی خوبصورتی ایسے ہی موقعوں پر شاہد ان
کے مصنع حسن کی طرح کھٹکتی ہے۔ میرے محترم جوش ملیح آبادی غزل ہی کو خلافِ فطرت اور خدا جانے کتنے خلافات سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اگر
یہ الزام تسلیم کرلئے جائیں تو "نظم" کا دامن بھی ان جرائم سے پاک نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ تسلیم کہ نظم اور غزل میں نئے قسم کے پارک اور پرانے قسم
کا سا فرق ہے لیکن کمپنی باغ کی نمائش گل کشمیر کے مناظر گل کا منہ بھی نہیں چڑھا سکتی، یہ الفاظ دیگر غزل کو جنرل مرچنٹ کی دوکان سمجھ لیں تو نظم کو
کارخانہ ضرور ماننا پڑے گا۔ معاشرت تمدن اخلاق تہذیب سب ہی تصنع ہیں۔

پھر اس کے بعد بیٹھے بیٹھے وقت آنکھیں ساون کی ندیاں ہو ہو گئیں۔ شاید اور اصحاب بھی سمجھتے ہوں میں تو ایک زمانے میں یہی سمجھتا تھا کہ رونا غم سے یا شکر ہی سے ہوتا ہے یا بقول دیگراں کسی زبردست مسرت سے لیکن شاید یہ کلیہ درست نہیں بعض اوقات رونا اس قدر لطیف ہوتا ہے کہ سبب و علت و معلول کے کوتاہ ہاتھ اس کے دامن تجرد تک پہنچ بھی نہیں سکتے۔ رو چکنے کے بعد سوچتا ہوں کہ کیوں رویا تو ہنسی تو نہیں آتی تعجب ضرور ہوتا ہے۔ دیکھئے ایک مقام پر کامرانِ ناکامی میں فرماتے ہیں جب اپنی تصویر دیکھی ہے تو کچھ لفظ اس کی زبان سے نکلے ہیں انہیں پڑھکر بے اختیار رو دیا۔ اس کا سبب؟ اس کو دیوانگی نہ سمجھئے گا۔ کسی کو کیا مجھے خود نہیں معلوم دل میں کتنے طوفان آسودہ ہیں کس لفظ کی جنبش کس طوفان کو جگا دے گی۔ خیر یہ تو ایک جذباتی تاویل تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ شے آپ کے حسِ تجرد کو بیدار کرتی ہے وہی قابلِ پرستش ہے اس قابل کہ تمام متاعِ ہوش و حواس دین و ایمان اس پر قربان کر دیئے جائیں وہ اچھا شعر ہو یا اچھی نثر حسین عمارت ہو یا دلربا صورت ؎

کوئی گلفام ہو یا گل کوئی نغمہ ہو یا ساغر — کوئی انداز ہو قاتل کوئی ہو دلربا منظر
یہ عصمت چاہتے ہیں تجھ سے جامِ بیخودی دیکر — محبت بخشتے ہیں تجھکو تیری بے حسی لیکر

ترا مٹنا ہے بن جانا سمندر ایک قطرے کا
تری گم گشتگی ہونا ہے خورشید ایک ذرے کا

(میکش)

ایک ادیب کا حقیقی حسن اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو اُس کی تصنیفات میں تلاش کیجئے۔ نہ دیکھئے کہ اُس کے خد و خال کیسے ہیں نہ پوچھئے کہ وہ کس یونیورسٹی کا سند یافتہ ہے، نہ سوچئے کہ اُس کا معشوق کس شکل و شمائل کا ہے، نہ تلاش کیجئے کہ اس کا عشق و محبت کن خصوصیات کا حامل ہے ان باتوں کا جواب وہ خود نہیں دے سکتا، آپ خود معلوم نہیں کر سکتے البتہ کسی نظم میں، کسی شعر میں، کسی جملے میں، کسی لفظ میں کہیں کہیں وہ عشق و محبت کے کامل حسیات، حسن و جمال کی بے پناہ تجلیات کے ساتھ نمایاں ہوگا اور ضرور نمایاں ہوگا۔

جی چاہتا تھا کہ انشائے لطیف پر مکمل تبصرہ کروں اس کی انشائی خصوصیات گنا کر اُس کے لطائف کی طرف اشارات کروں مگر یہ حقیقتاً ظلم ہوگا خود مصنف کے بقول پھول تو جبتک ہی ہے جب تک اُس کا تجزیہ نہ کیا جائے، اُس کی پنکھڑیاں اگر شمار کر لی جائیں اس کا وزن اور قطر اگر معلوم کر لیا جائے اُس کے اجزا تحلیل جان لئے جائیں، اُس کے اجزا ترکیبی تحقیق کر لئے جائیں تو سب مفید کام ہونگے مگر پھول نہ رہے گا۔

تنقید بہت مفید شے سہی مگر عاشقوں کے بس کا روگ نہیں

میکش اکبر آبادی

تصویرِ حیات کے دو رُخ

ہستی و مستی ——— عبرت و ویرانی

"اس مرتبہ دہلی سے واپس ہوتے ہوئے میری روح کو جس نظارے نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ نئی دہلی اور پرانے قلعوں کا عبرتناک تماشہ تھا۔ شام نے اس نظارے کو کیا مؤدب بنا دیا تھا۔ میں اپنے ان تاثرات کو بصورتِ نظم پیش کرتا ہوں۔ جن حضرات کو آگرہ آتے ہوئے مدراس ایکسپریس سے سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے اُن کے لئے یقیناً یہ نئی چیز ہے۔ وہ حضرات بھی اس نظم سے تجدیدِ لطف اندوز ہونگے جو دہلی کی جنت نگاہیوں اور ویران قلعوں کی عبرت سامانیوں کو دیکھ چکے ہیں۔" منظر

انقلاب اُف کس قدر عبرت بداماں انقلاب — ذرے ذرے سے ہے اے منظر نمایاں انقلاب
اک طرف ہستی و مستی کی بہاریں موجزن — اک طرف خاموش دُنیا غرقِ سیلابِ محن
اک طرف صبحِ چراغاں اور دُنیائے بہار — اک طرف تاریکیاں، تاریکیوں میں اضطرار
اک طرف کچھ قصر، کچھ کاخِ بلند و بے نظیر — اک طرف ویرانیاں قیدِ تعیّن میں اسیر
اک طرف سورج کی تابانی فروغِ زندگی — اک طرف عبرت کا آئینہ اُداسی شام کی،
اک طرف مشعل شبِ مہتاب کی بادہ فروش — اک طرف کچھ ظلمتیں عبرت بکف عبرت بدوش
اک طرف تارے زمیں کی سمت خود ٹوٹے ہوئے — اک طرف خاموش قلعے موت کے لوٹے ہوئے

آہ ان قلعوں میں رہتی تھیں کبھی آبادیاں — گونجتی تھی ساز کی لَے پر نشاطِ جاوداں
صبح کے جلوے نئے تھے شام کے تیور نئے — پیش کرتا تھا شفق کا آئینہ منظر نئے
رات آتی تھی یہاں بنکر مجسم کہکشاں — مسکراتا تھا ہر اک ذرے میں مہرِ ضوفشاں
تھے ضیا افروز اوراقِ کتابِ زندگی — اب کہاں وہ نزہتِ دورِ شبابِ زندگی

تھے یہی قلعے جہاں جھکتا تھا فرقِ آسماں — آج بن کر رہ گئے ہیں سُرخیٔ نظمِ خزاں
لٹ گئی وہ بزم، وہ رنگِ بہارِ گلستاں — دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگیا ہندوستاں
اب یہاں عبرت کی ہیبتناکیاں آباد ہیں — مرثیہ خوانِ زوالِ عالمِ ایجاد ہیں

اک طرف ہنگامۂ نو، اک طرف عالم اداس — اک طرف تابندگی، اور اک طرف خوف و ہراس
آہ کیا نظارۂ پُر درد و غم آثار ہے — صدمۂ بے انتہا نا قابلِ اظہار ہے

دیکھکر ناظر "نئی دہلی" یہ ویرانے بھی دیکھ
ناز تھا جن پر زمانے کو وہ کاشانے بھی دیکھ

منظر

وداعِ بہار

کل جہاں تھا آتشِ گل سے فروغِ گلستاں — اب خزاں کی ساحرہ، شعلہ بداماں ہے وہاں
پھول مرجھا کر فنا کی گود میں سب سو گئے — زرد شاخیں ہو گئیں، بے روح پتے ہو گئے
نو عروسانِ چمن کے شوخ رنگیں پیرہن — بن گئے نعشِ بہارِ آنجہانی کے کفن
تھا جو تصویرِ شگفتِ باغ میں پنہاں شباب — اک تنِ مردہ کی صورت ہو گیا وہ بے حجاب
اس طرح بے برگ سب رنگین پودے ہو گئے — جیسے آدم سے لباسِ خلد کوئی چھین لے
خوشنوایانِ چمن کی بولتی دنیا گئی — موت کی سی اک خموشی گلستاں پر چھا گئی
گل فسردہ ہو گئے، کلیاں سمٹ کر رہ گئیں — نازنیں شاخیں درختوں پر تڑپ کر رہ گئیں
نیم مردہ رہ گئے کچھ پھول ننگِ صحنِ باغ — جیسے دامانِ فضا پر خون کے ہوں سرخ داغ
اللہ اللہ یہ تغیر، یہ سماں، یہ انقلاب — کر دیا موجِ ہوا نے رازِ گلشن بے نقاب
فصلِ گل میں رنگ کا طوفاں فریب دیدہ تھا — یعنی اس پردے میں عالم دوسرا پوشیدہ تھا
اُٹھ گیا جب روئے گلشن سے حجابِ رنگ و بو — تازہ کچھ ویرانیاں خارِ نظر تھیں چار سو
گلشنِ ہستی کے عالم میں حجاب اندر حجاب — اس کا ظاہر ہے شگفتہ اور باطن ہے خراب

ہر نشاط اک ماتمِ سرمستیٔ مرحوم ہے
اے خرابِ جلوۂ گل، کچھ تجھے معلوم ہے؟

(متعلق تصویر)

سیماب اکبر آبادی

رُسوا ہو گئے

تیرِ غم شاید ہم آغوشِ تمنا ہو گئے — دل میں کچھ آثارِ بیداری کے پیدا ہو گئے

حسن و دنیا کی بساطِ ناز رُک سکتی نہیں — متحد جس روز اجزائے تمنا ہو گئے

حوصلہ افزا ہیں حسن و عشق کی نیرنگیاں — ہم ہوئے بیمار تو وہ بھی مسیحا ہو گئے

ـــ جمالِ یار لے برہم زنِ ہر انجمن — الاماں اب حشر کے آثار پیدا ہو گئے

ہم سے مانا انقلابِ چرخ کا بھی ہاتھ ہے — آپ بھی تو دشمنِ جانِ تمنا ہو گئے

جب طرفِ لطف اٹھے [illegible] نہیں کھو گئے — روشناسِ حسن ہونا تھا کہ رسوا ہو گئے

لے پیامِ مرگ آن کی زندگی کی قدر کر — جو تری آمد سے پہلے ہی شکیبا ہو گئے

آسماں سر در گریباں بجلیاں محوِ تلاش — ہم ترے جلووں میں گم ہو کر تماشا ہو گئے

انکے حسنِ روز افزوں کو دعا میں کیوں نہ دوں — تیری مرگِ ناگہاں کا جو ذریعہ ہو گئے

ایک ہم شاید زمینِ قبر پر بھی بار ہوں — ایک وہ روحِ روانِ بزمِ دنیا ہو گئے

ہم نہ کہتے تھے محبت کی خلش اچھی نہیں
دیکھنا سرشار کیا تھے اور تم کیا ہو گئے

سرشار کسمنڈوی

عرضِ حال

آبِ بقا حیات کے نغمے سناؤں گا،
رو رو کے اشکِ غم میں تجھے خوں رلاؤں گا،
طولِ شبِ فراق کی روداد کچھ نہ پوچھ
وعدہ شکن نتیجۂ بیداد کچھ نہ پوچھ
بے بال و پر کی حسرتیں صیاد کچھ نہ پوچھ
کب تک میں کور بختی کے قصے سناؤں گا

نظریں حیا بدوش ہیں دل ہے وفا پرست
بھولا نہیں ہے مجھ کو ترا وعدۂ الست
میری نظر میں طور کا جلوہ مکین ہے
میرا خیال تیری طلب کا امین ہے
روشن نشانِ سجدہ سے میری جبین ہے
ممکن نہیں کبھی بھی مرے حوصلے ہوں پست

تو جانِ آرزو ہے میں ناکامِ آرزو
تجھ کو تلاشِ غیر مجھے تیری جستجو
بچھڑا ہوں قافلے سے میں گم کردہ راہ ہوں
میرا وجود کیا ہے، فقط اشتباہ ہوں
دریوزہ گرِ وفا کا بحالِ تباہ ہوں
تو بحرِ بے کنار میں چھوٹی سی آبجو

کب تک رہیں گی مجھ سے تری بے نیازیاں
کب تک روا رہیں گی یہی حیلہ سازیاں
کب تک غمِ فراق کے صدمے اٹھاؤں گا
کب تک نہ خلوتوں میں تری بار پاؤں گا
امید کو کبھی تو حقیقت بناؤں گا
آ اب تو کر خدا کے لئے دلنوازیاں

یارائے ضبط ہے نہ سکون و قرار ہے
تیری قسم نگار بہت سوگوار ہے
اب اشک ہیں انیس و آہیں شریکِ حال
یا اپنی نامرادی کا احساس خال خال
یہ لو لگی ہے تیرا کبھی دیکھ لوں جمال
آنکھوں میں دم ہے، آ کہ ترا انتظار ہے

سروپ رانی نگار

جشنِ دعوت

اناطول فرانس کا شہ پارہ

۔۔۔ (تائیس کا تیسرا حصہ) ۔۔۔

تائیس جب پفنوتیاس کو ساتھ لئے ہوئے ایوانِ جشن میں پہنچی اکثر مہمان آچکے تھے؛ اور ایک نیم دائرہ میز کے سامنے کوچوں پر بیٹھنے سے زیادہ لیٹے کہ پڑے تھے۔ میز چمکیلے برتنوں سے سجی ہوئی تھی وسط میں ایک چاندی کا ظرف رکھا تھا' جس پر چار سے ٹیر (یونانی دیوتا، نیم انساں نیم حیوان) اس طرح قائم تھے کہ اپنے مشکیزوں سے، برتن کے اندر، ایک موٹی مچھلی پر شراب ٹپکا رہے تھے اور مچھلی اس پیالے کے اندر تیر رہی تھی۔ تائیس کو دیکھ کر ہر طرف سے مرحبا کی آوازیں اٹھنے لگیں۔

"تالت ثلاثہ، گریسیز (تین ہنیس دیویاں) کی بہن کو سلام!"

"خموش میلپومین (الم کی دیوی) جو اپنی آنکھوں سے ہر بات کہہ سکتی ہے سلام!"

"انسانوں اور دیوتاؤں کی بہترین محبوبہ کو سلام!"

"جو سب سے زیادہ مطلوب ہے اُسے سلام!"

"راکوٹیس کے موتی کو سلام!"

"اسکندریہ کے گلِ صد برگ کو سلام!"

تہنیت و مرحبا کا شور کم ہونے تک تائیس نے انتظار کیا اور پھر کوٹا، اپنے میزبان کو مخاطب کر کے کہنے لگی:۔

"لوسیاس، میں صحرا کے ایک راہب کو تمہارا مہمان بنا کر لائی ہوں۔ پفنوتیاس، انطینوئی کا رئیس خانقاہ، ایک بزرگ کامل ہے اور اس کی شعلہ بیانی بے مثال ہے"۔

لوسیاس آریس کوٹا، امیر البحر اُٹھا اور جواب میں کہنے لگا:۔

"خوش آمدید، پفنوتیاس! تم دینِ مسیح کے پیرو ہو۔ میں خود بھی اس مذہب کا احترام کرتا ہوں، کہ مسیحیت اب شہنشاہی مذہب بن چکا ہے۔ عالی مرتبت قسطنطین نے تمہارے ہم مذہبوں کو شہنشاہی حلیفوں کی صفِ اوّل میں جگہ دی ہے۔ لاطینی تدبر کا مقتضائیہ ہونا چاہیئے کہ مسیح کو ہمارے پین تھین (تمام دیوتاؤں کا ایک مندر) میں داخل کیا جائے۔ ہمارے آباو اجداد اس اصول کے پابند تھے کہ ہر دیوتا میں کچھ نہ کچھ ساویت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اب اس ذکر کو جانے دو، آؤ جب تک مہلت ہے کچھ کھا پی کر مزا کریں!"

معمر کوٹا نے بکمال لطف و مسرت پذیرائی کی رسم پوری کی۔ اُس نے آج ہی ایک جنگی جہاز کے نمونے کا معائنہ کیا تھا اور تاریخ قرطاجنہ کی چھٹی جلد

کی تالیف کی تھی۔ وہ مطمئن تھا کہ آج کا دن ضائع نہیں ہوا اس لئے دیوتاؤں سے اور اپنے آپ سے بھی خوش تھا۔

پفنوتیاس، یہ چند صورتیں جو تم دیکھتے ہو سب محبت کے قابل ہیں: ہرمودورس سیراپیس کا اعظم، فلسفی دریان، نکیاس اور زینوتیمیس، شاعر کلی کراتیس، نوجوان کیریاس اور ارستوبلوس، دونوں ایک پرانے دوست کے لڑکے اور ان کے قریب میں بیٹھی ہوئی فلینا اور درد سیا ہیں جن کا حسن اور محبوبی ہر تعریف کے مستحق ہیں

نکیاس، پفنوتیاس کے ساتھ بغلگیر ہوا اور چپکے سے کان میں کہا:

"برادر، میں نے تمہیں آگاہ کر دیا تھا کہ دیکس بہت زیادہ قوت والی دیوی ہے یہ اسی کی غیر محسوس قوت ہے جو باوجود زہد و اتقا تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے غور سے سنو تم ایک نیک و پارسا آدمی ہو، اگر یہ عقیدہ قائم نہ کرو گے کہ تامیس ام مسیح ہے تو تمہاری تباہی و موت یقینی ہے تمہیں معلوم نہیں کہ بڑا ریاضی دان میلاتھیس کیا کہا کرتا تھا؟ اس کا قول تھا کہ میں ایک مثلث کی تعریف دمیس کی امداد کے بغیر نہیں کر سکتا۔"

دریان تھوڑی دیر تک نووارد کو دیکھتا رہا اور پھر ہاتھ پر ہاتھ مار کر حیرت میں پکار اٹھا:

"ہاں وہی تو ہے! اسی کا بشرہ ہے، اسی کی ڈاڑھی اور اسی کی قمیص! دوستو، میں اس نووارد سے تھیٹر میں مل چکا ہوں جہاں ہماری تامیس ایکٹ کر رہی تھی یہ شخص دوران تماشے میں یکایک بھڑک اٹھا تھا اور غصے میں چیختا رہا لیکن اس کی میں تصدیق کروں گا کہ وہ ایک سچا آدمی ہے۔ گر یہ بھی یقینی ہے کہ وہ ہم سب کو بھی برا بھلا کہے گا۔ اس کی طاقت بیان خطرناک ہے اگر مرقس میسیحوں کا افلاطون ہے تو پفنوتیاس ان کا ڈیموستھینیز ہے ایکیورس نے بھی اپنے باغ میں اس کی مثال نہ دیکھی ہوگی۔"

فلینا اور درد سیا کی نگاہیں، تامیس کو نگل جانا چاہتی تھیں: اس کی زلف زریں پر بنفشے کے پھولوں کا گجرا تھا اور پھولوں کی بیرنگی اس کی نائم آنکھوں سے ملتی جلتی تھی۔ اس ہم آہنگی نے پھولوں کو نرم نگاہیں بنا رکھا تھا اور اس کی آنکھیں شاداب گل بنفشہ معلوم ہوتی تھیں فطرت کا یہ مخصوص عطیہ تھا کہ تامیس کے جسم پر پہنچ کر ہر شے میں جان پڑ جاتی تھی، روح ہم آہنگی بجاتی تھی۔ اس کے ہلکے فالسئی رنگ کی ردا پر ستارے کا کام تھا اور اس کی لانبی لپٹوں کی شان ادا میں ادا سی کا انداز تھا، جسے نہ تو اس کے کنگنوں کی چمک ربع کر سکتی تھی نہ اس کے گلوبند کی حرکت اس کے مینا خانۂ شباب اور آئینہ ساری حسن کا سب سے بڑا طلسم اس کے بازوؤں کے بلوریں گداز میں تھا۔ دونوں سہیلیاں باوجود رشک و فطرت نسوانی تامیس کی طرح شکن زلف و طرز کلہ اور انداز رنگ رو کے سراہنے پر مجبور تھیں ——— لیکن اس کی مدارین انھوں نے تامیس سے ایک لفظ نہ کہا

تمہارا حسن کس قدر ملاخیز ہے! فلینا نے تامیس کو مخاطب کیا "تم جب اسکندریہ پہنچی تھیں تو غالباً اتنی حسین نہ ہوگی۔ اگرچہ میری ماں نے تمہیں اس وقت دیکھا تھا اور وہ کہتی تھی کہ اسکندریہ میں چند ہی عورتیں تمہارے مقابلے میں لائی جا سکتی تھیں

"آج تمہارے ساتھ یہ نیا آشنا کون ہے؟" درد سیا نے سوال کیا "اس کی شکل عجب وحشت ناک ہے۔ اگر کہیں ہاتھیوں کے پکڑنے والے ہیں تو یقیناً وہ اسی کی مشابہ ہوں گے۔ تمہیں یہ وحشت زدہ دوست، تامیس مل کہاں سے گیا؟ ان وحشیوں میں سے تو نہیں جو کھوؤں کے اندر رہتے اور تھیبڈ (عالم برزخ) کے دھوئیں سے میلے رہتے ہیں؟"

فلینا نے درد سیا کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور اسے خموش کر کے کہنے لگی:-

"خاموش! یہ رموز عشق ہیں، ان کا جاننا ممنوع ہے، لیکن اگر مجھ سے پوچھو تو میں سنگتے ہوئے اتنا: ایک جوالا مکھی کے ہونٹوں کے بوسے کو اس آدمی

ِسے پر ترجیح دوں گی مگر ہماری پیاری تائیس دیویوں کی طرح حسین اور دیویوں ہی کی طرح قابل پرستش ہے۔ اس لئے اسے دیویوں ہی ارح ہر فتی کی مراد پوری کرنا چاہئیے ہماری طرح نہیں کہ صرف خوش وضع نوں ہی کی آرزو کریں!"

"لڑکیو، ذرا سوچ سمجھ کے!" تائیس نے جواب میں کہا۔ وہ ایک مجوش ساز آدمی ہے وہ نہ صرف سرگوشیاں لیتا ہے بلکہ خیالات بھی پڑھ لیتا حوقت تم خوب نا رہی ہوگی ہیلو چاک کرکے وہ تمہارے دل نکال اور اُن کی جگہ اسپنج کے ٹکڑے رکھ دے گا اور صبح جب تم پانی پیوگی تو یاں آتے آتے دم نکل جائیگا!"

وہ دونوں ڈر گئیں اور تائیس ان کے پاس سے اٹھ کر نفوتیاس کی طرح پر جا بیٹھی مگر جانب دبی دبی باتیں ہو رہی تھیں کہ کوٹاکی بلند آواز کتی سنائی دی۔

"مستقو! سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں، علافو انگیفی شراب ملے!"

اور پھر میزبان نے اپنا جام اٹھا کر کہا۔

"دوستو، سب سے پہلے جان شہنشاہی علوی قسطنطین کی! دیہاتی وطن مقدم ہے، دیوتاؤں سے بھی مقدم ــــــ کہ وطن میں تو دیوتا بھی شامل ہیں۔"

تمام مہمانوں نے اپنے جام ہونٹوں سے لگالئے مگر نفوتیاس ویسے ہی بیٹھا رہا کیونکہ قسطنطین نے ایک تو یونانی عقیدے کے عیسائیوں پر مظالم روا رکھے تھے دوسرے پیروان دین مسیح کا وطن جو زمین ہے یہی نہیں

دریان نے اپنے ساغر خالی کرکے کہا۔

"در اصل، ایک شخص کا وطن ہے کیا شے؟ ایک بہتی ہوئی ندی کے کنارے ہمیشہ بدلنے میں رہتے، اور اس میں ہمہ وقت نئی نئی موجیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

"دریان، میں جانتا ہوں" امیر البحر نے جواب دیا "کہ تم عمرانی خوبیوں کی پروا نہیں کرتے ہو، اور تمہارا خیال ہے کہ اہل فہم و ہوش کو ان تمام لغویات سے بالاتر ہونا چاہئیے۔ لیکن اس کے برعکس میں سمجھتا ہوں کہ ایک متدین انسان کی بہترین خواہش یہ ہونا چاہئیے کہ وہ سلطنت کا کوئی ذمہ دارانہ منصب حاصل کرے: حکومت ایک محترم شے ہے!"

"ہرمودورس، سیراکس کے کاہن اعظم نے کہا:۔
دریان کا سوال ہے کہ وطن ہے کیا؟ میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ معابد کے منبر اور آبا و اجداد کی قبریں، یہ ہے وطن کی تعریف! آثار اور یادگاروں میں اشتراک اور فضائے اُمید کی یکرنگی دو انسانوں کو ہم وطن بنا دیتی ہے"

"نو عمر ارستوبولس نے ہرمودورس کا قطع کلام کرکے کہا:۔

"قسم ہے کیسٹر اور دو بھائیوں کی آئیڈیل کا نمونہ جن کو جوپیٹر نے دو ستاروں میں تبدیل کر دیا تھا، کہ آج میں نے ایک نہایت خوبصورت گھوڑا دیکھا، ڈیماؤن کا گھوڑا! حسین چہرہ، چھوٹے جبڑے اور مضبوط ہاتھ پاؤں! جب چلتا ہے تو مور کی طرح اپنی پر غرور گردن اٹھا کر چلتا ہے"

لیکن سیرایس نے گردن کو جنبش دی:۔

"ارستوبولس، جتنی تعریف تم کرتے ہو، وہ اتنا اچھا تو نہیں۔ اس کے سم پتلے ہیں اور کلائیاں بہت نیچی ہیں تم دیکھو گے کہ وہ بہت جلد تنگ کرنے لگے گا"

بحث ہو ہی رہی تھی کہ دروسیا نے ایک چیخ ماری:۔

"اوہ! میں مچھلی کا کانٹا نگل ہی گئی تھی، سوئی کے برابر لانبا اور تیز! خیر گذری کہ میں حلق کے اندر سے نکال سکی دیوتا یقیناً مجھے پیار کرتے ہیں"

"دیوتاؤں کو تم سے محبت ہے، تم نے یہی کہا نا؟" نکیاس نے مسکراتے ہوئے کہا "تو گویا دیوتاؤں میں بھی انسانی کمزوریاں ہیں۔ یہ تو مسلم ہے

کہ محبت اپنے مبتلاؤں کو غیر آسودگی و الم کی بشارت دیتی ہے — اور یہ کمزوری کا ثبوت ہے۔ دروسیا کے لئے جو محبت دیوتاؤں کے دلوں میں ہے ان کے ناکمل ہونے کی بڑی دلیل ہے"۔

اس پر دروسیا بہت برہم ہوئی۔

"نکیاس، تمہاری گفتگو احمقانہ اور مہمل سے الگ ہے لیکن یہ تو تمہاری عادت ہے — گفتگو کا موضوع تم کبھی نہیں سمجھتے اور بات وہ کہتے ہو جس میں کوئی معقولیت نہیں ہوتی"۔

نکیاس نے پھر مسکرا کر کہا:-

"بکے جاؤ، دروسیا چپ نہ ہو جاؤ۔ تم جو کچھ بھی کہو، مونہہ تو کھلتا ہے۔ ہمیں تو اس سے مسرت ہوتی ہے کہ تمہارے حسین دانت نظر آجاتے ہیں"۔

اس موقع پر ایک سنجیدہ شکل و صورت کا آدمی، گردن اٹھائے، آہستہ آہستہ داخل ہوا، اور خموشی کے ساتھ مہمانوں پر نظر ڈالی اس کا لباس بے خیالی و محویت کا ثبوت تھا۔ کوٹا نے اسے اپنی کوچ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا:-

"خوش آمدی، یوکریٹس۔ اس مہینے میں فلسفے پر کوئی اور مقالہ لکھا؟ اگر ہاں، تو میرے حساب کے مطابق نیل کے نیستانی ساحل سے ایک لائق و فائق دماغ سے نکلا ہوا، یہ بانوے واں مقالہ ہوگا!"

یوکریٹس نے اپنی سفید داڑھی کریدتے ہوئے جواب دیا:-

"بلبل نغمہ سرائی کے لئے پیدا کی گئی ہے اور میں غیر فانی دیوتاؤں کی منقبت و توصیف کے لئے پیدا کیا گیا ہوں"۔

دریان — ہم سب کو یوکریٹس کی ذات میں جو ہمارے درمیان سفید و سنجیدہ بزرگوں کی تمثال کی طرح ہے، آخری رواقی کا سلام اور مجرا بجالانا چاہئے: انسانوں کے ہجوم عام وہ یکہ و تنہا ہے، کہ جو کچھ وہ کہتا ہے سنا نہیں جاتا۔

یوکریٹس — دریان، تم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہو نیکی کا فلسفہ ابھی مرا نہیں ہے۔ اسکندریہ، روما اور قسطنطنیہ میں میرے شاگرد بکثرت ہیں: بہت سے غلام ہیں اور رئیس ایک قیصر کے بھتیجے ہیں۔ یہ لوگ اپنے نفس پر حکومت کرنا جان گئے؛ اور وہ واقف ہیں کہ آزاد و علائق ہو کر کس طرح زندگی بسر کرنا چاہئے۔ معاملات دنیا سے یکسر بے تعلق رہ کر وہ لوگ خوش بسر بھی ہیں۔ ان میں سے اکثر نے اپنی ذات میں ایپکٹی ٹس اور مارکس آرلیس کو زندہ کر لیا ہے۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ دنیا سے نیکی کا وجود ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گیا ہے تو اس کا انعدام میری آسودگی کو کیونکر متاثر کر سکتا ہے جبکہ اس کا وجود و عدم میرے اوپر منحصر نہ تھا؟ دریان، خوشی کو اپنے اختیار سے باہر سمجھنے والی صرف احمقوں کی جماعت ہو سکتی ہے۔ دیوتاؤں کی جو مرضی نہیں میں بھی اس کی خواہش نہیں کرتا، اور جو وہ چاہتے ہیں مجھے اس سب کی آرزو ہے۔ اس طرح پر میں اپنی ذات کو ان میں ملا دیتا اور ان کی مستقل بے نیازی میں شریک ہو جاتا ہوں۔ اور اگر نیکی معدوم ہوتی ہے تو میں اس پر بھی راضی ہوں کہ وہ مٹ جائے؛ اور میرا یہ راضی برضا ہونا ہی میری عقل ہمت کی انتہائی کوشش کا ثبوت اور یہی میری مسرت کا سبب ہے۔ میری عقل ہر معاملے میں علوی تعقل کی نقل کرے گی، اور اصل سے نقل زیادہ قابل قدر ہوتی ہے، کیونکہ اس میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے اور زیادہ کام کیا جاتا ہے

نکیاس — میں سمجھا تم اپنے آپ کو اسی درجے پر سمجھتے ہو جس درجے پر قدرت ساری کو مانتے ہو۔ لیکن یوکریٹس، اگر نیکی نام ہے سعی و کوشش اور شدت عمل کا جس کی بنا پر زیکو تنبعین اپنے تئیں دیوتاؤں کی ہمسری کے توہم میں مبتلا کر لیتے ہیں، تو ایک مینڈک جو ایک بیل بجانے کی سعی و عمل میں اپنے آپ کو پھلا لیتا ہے، درحقیقت، مسلک رواقیین کا ایک شہ پارہ پیش کرتا ہے۔

یوکرٹیس —— نکیاس تم مذاق کرتے ہو اور حسب معمول تمہارا تمسخر اس وقت بھی بے مثال ہے لیکن جس بیل کی طرف تم نے اشارہ کیا اگر وہ آپیس (قدیم مصریوں کا بیل دیوتا) یا گاؤِ زمین کی طرح، جس کے بڑے پجاری کو میں یہاں دیکھ رہا ہوں، ایک دیوتا ہے، اور اس مینڈک کی کوشش الہام و دانائی کا نتیجہ ہے، اور وہ اس کی برابر پہنچانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو کیا فی الواقع وہ اس بیل سے زیادہ محترم نہ ہو جائے گا؟ اور کیا تم اس چھوٹے سے جانور کی اس سعی بے سالت کی داد نہ دو گے؟

چار غلاموں نے ایک مسلّم بنڈیلا لا کر میز پر رکھدیا، جس کے بال بجنسہٖ قائم تھے اور آٹے کے بنے ہوئے چند بچے اس کے گرد لگے ہوئے تھے؛ جس سے معلوم ہوتا کہ وہ دودھ پینے کے لئے چمٹے ہوئے ہیں —— یعنی یہ کباب مادۂ خنزیر کا ہے

زینو تھیمیس نے راہب کی طرف دیکھکر کہا:-

"دوستو ایک غیر متوقع مہمان کی موجودگی ہماری مسرت کا باعث ہے محترم پفنوتیاس، جس کی عزلت در یاضت کی غیر معمولی زندگی زبانِ زدِ خاص و عام ہے"

کوٹا —— زینو تھیمیس اتنا اور اضافہ کرو کہ آج کی صدر نشینی اسی کا حق ہے کیونکہ وہ بلا دعوت آیا ہے۔

زینو تھیمیس —— اس لئے عزیز لوکیاس، ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کا بیش از بیش خیر مقدم کریں اور اسے زیادہ سے زیادہ خوش کرنیکی کوشش کریں۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ جو شخص علوی تخیلات کی خوشبوؤں میں بسا ہوا ہے، کھانے کی مہک اس کی توجہ کو کیا جذب کر سکتی ہے، ہو لئے اُس کی ضیافت طبع کے لئے جس مذہب کا وہ پیرو ہے، یعنی مسیح مصلوب، اسی کے متعلق گفتگو کی جائے۔ جہانتک میری ذات کا تعلق ہے، میں اس گفتگو میں نہایت خوشی کے ساتھ شریک ہو سکوں گا، کیونکہ مجھے اس مسئلے میں کمال دلچسپی ہے؛ اور اس کی وجہ اس کی تمثیلات و تشبیہات کا تعدد و تفاوت ہے۔ اگر الفاظ سے روح معانی پر قیاس کیا جا سکتا ہے تو مسیحیت صداقتوں سے معمور ہے، اور میرا خیال ہے کہ صحفِ عیسوی علوی الہامات سے لبریز ہیں۔ لیکن پفنوتیاس، یہی درجہ میں کتب اسرائیل کو نہیں دے سکتا۔ جیسا کہ دعوےٰ کیا جاتا ہے وہ ملہمات ربانی نہیں بلکہ ایک فطرت زبوں کا کلام ہے۔ وہ کلام جس سے منسوب ہے اس کا نام یہوہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہوہ خود سما کے ادنیٰ طبقات کے رہنے والی روحوں میں سے کوئی تھا، جو بیشتر ان خرابیوں کا باعث ہوتی ہے جن سے نسل انسانی متاثر ہوتی ہے۔ بہرحال وحشت و جہالت میں یہوہ بے مثال تھا۔ اس کے برعکس شجرِ علم سے لپٹے ہوئے نیلگوں پیچ و خم یعنی سنہری پروں والے سانپ کا خمیر نور و محبت سے ہوا تھا۔ چنانچہ ان دو طاقتوں یعنی نور و ظلمت کے مابین معرکہ آرائی لابدی نتیجہ تھا۔ یہ معرکہ تکوین عالم کے بعد ہی رونما ہوا۔ خداوند یہوہ اپنی مشقت تخلیق سے فارغ ہو کر بمشکل آرام لینے پایا تھا اور آدمؑ و حوّا باغِ عدن میں آسودہ و خرم تھے کہ ان کی بدنصیبی سے، اس نے اُن پر اور اُن کے صلب و رحم میں مخفی نسلوں پر مستقل حکومت کا نقشہ قائم کر لیا مگر اس کے پاس نہ تو پرکار تھی اور نہ سرود تھا، وہ علم (سائنس) سے بے بہرہ تھا، جو فرمانفرما ہے اور فن (آرٹ) سے لابلد تھا جو ولولہ انگیز ہے۔ اس نے فطرت کے ان دو غریب بچوں کو مہیب شکلوں، گوناگوں تخویف اور کڑک اور گرج سے سہما دیا۔ آدمؑ و حوّا جب اپنے اوپر اس کا سایہ پڑتا دیکھتے، ایک دوسرے سے چمٹ جاتے تھے؛ اور اس خوف کے اندر ان کی محبت شدید مگر محدود ہو کر رہ گئی۔ بالآخر سانپ نے اُن پر ترس کھایا اور اُن کو تعلیم دینے کا تہیہ کر لیا۔ کیونکہ علم حاصل کر کے ہی وہ جہالت کی پیروی سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ اس اقدام کے لئے سخت احتیاط کی ضرورت تھی، مگر اس جوڑائے انسانی کی فطری کمزوری نے اس احتیاطی پہلو کو قریب قریب معدوم ہی

کردیا تھا۔ تاہم نیک نیت سانپ نے کوشش کی ہوّا سے چھپ کر جسے اُدعان تو ہر معاملے پر نظر رکھنے کا تھا مگر درحقیقت زیادہ تیز نظر نہ تھا، سانپ ان دونوں کے پاس پہونچا، اور اپنی خوشرنگی اور پروں کی رونق سے اُنکی نگاہوں کو مسحور کرلیا۔ پھر اپنے لچیلے جسم سے اُن کے سامنے دائرے، بیضوی اور پیچیدہ شکلیں بنا بنا کر، جن کے حیرتناک مفاہیم کی تصدیق اس عہد کے برنا یونانیوں نے کی۔ اُن کے ذہن و خیال کو اُلجھا لیا۔ آدمؑ نے حوّا سے زیادہ ان اشکال پر فکر و غور کیا۔ لیکن جب سانپ نے گفتگو شروع کی اور اعلیٰ صداقتوں کی تلقین کرنا چاہی —— وہ صداقتیں جن کا ثبوت شواہد و نظارے نہیں دیا جا سکتا —— تو مجھے معلوم ہوا کہ آدمؑ چونکہ سُرخ مٹی سے بنا تھا، ان نازک امتیازات کو سمجھنے کے لئے بھی نعلات واقع ہوا تھا، لیکن اس کے برخلاف حوّا زیادہ نرم و نازک اور ذکی الحس ہونے کے باعث بآسانی متاثر کیجا سکتی تھی۔ اس لئے جب اس کا شوہر موجود نہ تھا، سانپ نے تنہائی میں ملکر اُس سے گفتگو کی تاکہ پہلے ہدایت حوّا ہی کو ہو

دریان —— زیونیمس، قطع کلام معاف کرنا، تمہارے اس بیان سے مجھے ایک پُرانا قصہ یاد آ گیا جو پالاس ایتھینی، عقل کی دیوی، اور دیوکی جنگ کا ایک واقعہ ہے۔ ہیرہ اس عورتِ خاتونوں سے بہت مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ اور ایتھنس والے پالاس کے مرقعے میں سانپ ضرور دکھاتے ہیں لیکن تمہارے بیان کے مطابق مجھے سانپ کی عقل اور نیک نیتی میں سخت شبہ ہے اگر واقعی وہ علم سے بہرہ ور تھا تو کیا وہ اس علم کو عورت کے تنگ دماغ میں داخل کر سکتا تھا، جس کے اندر اس کے سمانے کی گنجائش ہی نہیں؟ میری سمجھ میں تو وہ بھی ہوّا کی طرح سے علم و لاف زن تھا اُس نے حوّا کو محض اس لئے منتخب کیا کہ وہ بآسانی پھسلائی جا سکتی تھی، اور آدمؑ کے متعلق اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ذہین ہے اور اُس کی قوت تصور بہتر ہے

زیونیمس —— لیکن دریان، ذرا غور کرو! علوی صداقت تک پہنچنے کے لئے ذہن و تصور کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ نازک احساس درکار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں ذکی الحس زیادہ اور متفکر کم ہے اور اشیاء سماوی کے علم میں بسہولت بلند ہو سکتی ہے۔ عورت کے اندر ہدایت یا غیب دانی کا جوہر ہے۔ اپالو سیتھار یڈ نواز اور مسیح نصرانی کو عورتوں کے لئے ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں پیش کرنے کی تخیل کی علت بھی یہی ہے اس لئے —— تم جو چاہو سمجھو —— اسے سانپ نے وہ اور ستاروں سے صبیح تر اور ذکی حوّا کو نور علم سے آراستہ کرنے اور ذکی الحس آدمؑ کو اس سے محروم رکھنے میں دانائی سے کام لیا۔ حوّا بلا تکلف اس کی گفتگو سنتی تھی اور بالآخر اس کی رہبری میں شجر علم تک پہنچ گئی اس درخت کی شاخیں آسمان میں تھیں اور شہنیاں شبنم کی طرح وحیِ سماوی میں غسل کرتی رہتی تھیں۔ اس کی نبیوں انسان کے مستقبل کی تمام باتیں بولتی تھیں اور ان بانوں کی متفقہ آواز ایک مکمل ہم آہنگی تھی۔ طلبگار علم اس درخت کے بیشمار پھلوں میں سے ایک پھل کھاتا اور اسے جمادات، معدنیات، نباتات اور طبعی داخلاقی قوانین کا علم ہوتا۔ لیکن یہ پھل آگ کی طرح جلتے تھے اور جو لوگ تکلیف اور موت سے ڈرتے وہ اسے منہ تک لیجانے کی جرات نہ کر سکتے تھے۔ الغرض جب حوّا نے سانپ کے تعلیمات غور و توجہ کے ساتھ سنیں تو یہ خطرات اُس کی نظر میں بے معنی معلوم ہونے لگے۔ وہ اس پھل کے کھا لینے پر آمادہ ہوگئی جس سے الوہیت کا علم حاصل ہو جاتا تھا مگر محبت کے باعث اسے گوارا نہ ہوا کہ آدمؑ خود اس سے بیبہرہ و ادنیٰ رہ جائے۔

چنانچہ حوا، آدم کا ہاتھ پکڑ کر اس عجیب و غریب درخت کے پاس لے گئی، اور ایک شعلہ سا سیب توڑ لیا، دانتوں سے کاٹ کر تھوڑا خود کھایا اور باقی اپنے رفیق حیات کو دے دیا۔ شومیٔ قسمت سے ہوّا اس وقت باغ کے اندر گھوم رہا تھا اور سوء اتفاق سے دفعتاً اُدھر آ نکلا۔ یہ دیکھ کر کہ انسانی جوڑے کو علم و عقل آ گئی، سخت غیظ و غضب میں مبتلا ہوگیا۔ یہوہ پر جب

جذبۂ رشک طاری ہوتا تو وہ نہایت خوفناک ہوجاتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی تمام طاقتیں یکجا کرکے فضا کے طبقۂ اسفل میں اتنا کچھ ہنگامہ بپا کردیا کہ یہ دو ناتواں ہستیاں سخت خوف و دہشت میں مبتلا ہوگئیں۔ آدمؑ کے ہاتھ سے پھل گر گیا اور حوا اپنے کم نصیب شوہر کی گردن سے لپٹ کر کہنے لگی:-

"اس کے ساتھ میں جاہل رہونگی اور مصیبت جھیلوں گی"

منصور و کامراں یہوہ نے آدمؑ و حواؑ اور ان کی نسلوں کو خوف و تذبذب میں مبتلا کردیا۔ اُس کا فن (آرٹ)، جو محض بڑے بڑے شہاب ثاقب تک محدود تھا، سانپ کے علم (سائنس)، پر جو موسیقی اور ہندسہ حساب کا ماہر تھا فتح مند ہوگیا۔ اس نے انسان کو جاہل، ناانصاف اور بےرحم بنا کر دنیا میں بدی کی حکومت قائم کردی۔ اُس نے قابیل اور اُس کی اولاد پر مظالم توڑے کیونکہ وہ صناع اور کاریگر تھے اُس نے فلسطینوں کو مٹا دیا کیونکہ وہ مترنم نظمیں کہتے اور افسانے لکھتے تھے وہ علم و حسن کا سخت ترین دشمن تھا۔ ایک طویل مدت تک سانپ کی شکست و ہزیمت کا تاوان اولادِ آدم اپنے آنسوؤں اور خون سے ادا کرتی رہی۔ خوش بختی سے یونان میں فیثا غورث و افلاطون جیسے حکما پیدا ہوئے اور اپنی فطنت کی طاقت سے وہ تخیل و اشکال معلوم کرلئے جو یہوہ کے حریف سانپ نے پہلی عورت کو سکھانا چاہے اور ناکام رہا تھا۔ عورت کے اندر اسی سانپ کی روح ہے۔ اور جیسا ابھی دریان نے کہا، اہلِ یونان اسی سبب سے سانپ کو محترم مانتے ہیں۔ اس عہدِ آخر میں تین ساری روحیں نمودار ہوئیں: جلیا سے یسوع، ہبی لیشڈیس اور روبلنٹی نس، جن کے لئے مقدر تھا کہ شجر علم سے، جس کی شاخیں عالم پر محیط ہیں اور چوٹی فلک بوس ہے، بہترین پھل چن لیں۔ اس بیان سے بہر مقصود مسیحیوں کی مدافعت تھی،

یہودیوں کی غلطیاں جن کے سر تھوپی جاتی ہیں

دریان —— زیوٹیمیس، اگر میں نے تمہارا مفہوم غلط نہیں سمجھا ترین ہیبتناک شخصیتوں، یعنی مسیحؑ، ہبی لیشڈیس اور روبلنٹی نس نے وہ اسرار علم پالئے جو فیثا غورث و افلاطون نیز اور تمام فلاسفۂ یونان دریافت نہ کرسکے تھے، حتیٰ کہ محترم اپیقورس بھی، جس نے کم سے کم مجھے تو فضول وحشت اور جھوٹے ہول سے نجات دے دی ہے۔ میں ممنون ہونگا اگر تم یہ بھی واضح کردو کہ ان فانی ہستیوں نے وہ علم کن ذرائع سے حاصل کیا جن تک ان ستودہ حکما و فلاسفہ کی دسترس نہ ہوسکی تھی

زیوٹیمیس —— کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ علوم اور ان پر غور و فکر علم حقیقی کی ابتدائی سیڑھیوں سے زیادہ کچھ نہیں، اور یہ کہ صرف وجدان و کمال وہ چیز ہے جو سرمدی صداقت تک رہنمائی کرتی ہے؟

ہرمودورس —— یہ سچ ہے کہ روح کی غذا وجدان و کمال ہے، اسی طرح جیسے مچھر کی غذا شبنم ہے اس میں ابھی اور اضافہ کیا جاسکتا ہے؛ یعنی مسرت کامل اہل ثمر نفس انسانی ہے کیونکہ انسان کی سرشتیں تین ہیں؛ ایک یہ جسم مادی، دوسرے روح جس میں بیشتر علویت مگر ایک جزوِ مادیت بھی ہے اور تیسرے اس کا ناقابلِ تخریب نفس۔ نفسِ انسانی جب دفعتہ اپنے قصرِ جسم کو خالی کرتا اور اُسے تنہا چھوڑتا ہے تو وہ روح کے گلستانوں پر پرواز کرتا ہوا ذاتِ باری کے اندر پناہ حاصل کرلیتا ہے۔ اور متوقع موت یا بالفاظ دیگر حیاتِ مستقبل کی لذتیں چکھتا ہے۔ کیونکہ مرنے کے معنی زندہ ہونے کے ہیں؛ اور نفس اپنی اس حالت میں علوی عفت سے بہرہ ور ہوتے ہوئے لامحدود مسرت اور کامل علم حاصل کرلیتا ہے۔ وہ اس ذاتِ واحد میں شامل ہوجاتا ہے جو "کل" ہے اور اس طرح کامل بن جاتا ہے۔

نکیاس —— نہایت خوب! لیکن ہرمودورس اگر سچ پوچھو تو مجھے "کل" اور "ہیچ" میں کوئی بڑا فرق نظر نہیں آتا۔ خود یہ الفاظ بھی اتنا کو

ظاہر کرنے سے قاصر معلوم ہوتی ہیں۔ تب پاپانی "بھی وہی شے ہے جو ابتدا" سے ہے دونوں صورتیں ذہن و دماغ کے لئے ناقابل تصور ہیں۔ میری رائے میں حصول کمال گراں قیمت شے ہے، اس لئے کہ اسے حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنی ہستی دے دینا پڑتی ہے؛ اس پر تصرف پانے کے لئے ہماری ہستی کا ختم ہو جانا ضروری ٹھہرتا ہے۔ یہ ایک ایسی بدبختی ہے جس سے خود خدا بھی محفوظ نہیں۔ عقلائے دہر خدا کو مکمل ثابت کرنے کے لئے انتہائی کاوشیں کر رہے ہیں بالآخر جس طرح ہم نہیں جانتے کہ "نیست" کیا ہے اسی طرح ہم لاعلم ہیں کہ "ہست" کیا ہے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کے لئے اس مسئلے پر متفق ہو جانا ناممکن ہے لیکن میرا یقین اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ ہماری پرشور بحثوں کے باوجود انسان کے لئے ناممکن ہے کہ اگر وہ اپنے اختلافات ہی کے انبار کے اندر رہ کر ایک وحدت نہ بن جائے!

کوٹا —— مجھے فلسفے سے عشق ہے اور اوقات فرصت میں مطالعہ بھی کرتا رہتا ہوں۔ لیکن میں اس کو سیسرو کی کتابوں کے علاوہ اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا غلامو، بادہ انگبین کا دور ہو۔

سیکرائیس —— یہ ایک طرفہ بات ضرور ہے لیکن جب مجھے بھوک لگی ہوتی ہے تو اس عہد کا تصور بندھ جاتا ہے۔ جب شعرائے حزینہ نگار، (ٹریجک) متصدد سفاکوں کے دسترخوانوں پر جگہ پاتے تھے، اور میرے مونہہ میں پانی بھر آتا ہے۔ لیکن جب میں تمہاری شرابیں پیتا ہوں، جو فیاض لولیاس، تم اتنی فراخدلی کے ساتھ فراہم کرتے ہو تو مجھے فاتح جنگجوں اور دلیرانہ مقابلے کے خوابوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ میں اس پست و ذلیل عہد میں جینے سے شرماتا ہوں، اور آزادی کی دیوی سے دعائیں مانگتا ہوں، اور —— عالم خیال میں —— قلبی کے میدانوں میں عساکر روما کے ساتھ اپنا خون بہایا کرتا ہوں۔

کوٹا —— زوال جمہوریت کے زمانے میں میرے اجداد نے بروٹس کے ساتھ جنگ حریت میں اپنی جانیں دیدیں۔ لیکن اس میں شک کی گنجائش ہے کہ باشندگان روما جس چیز کو حریت سے تعبیر کرتے تھے وہ صرف اپنے اوپر حکومت کرنے کا حق تھا۔ مجھے انکار نہیں کہ حریت ایک قوم کے لئے سب سے بڑی نعمت ہے، لیکن میری عمر جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے میں اس خیال کی طرف مائل ہوتا جاتا ہوں کہ صرف طاقتور حکومت ہی شہریوں کو آزادی دے سکتی ہے۔ چالیس سال سے میں حکومت کے اعلیٰ منصبوں پر مامور ہوتا رہا ہوں۔ میرا طویل تجربہ تو یہی ہے کہ جب قوائے حکومت میں اضمحلال پیدا ہونے لگتا ہے تو رعایا پر تمرانیاں بھی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے فصحا و مقررین کی اکثریت کی طرح جو لوگ حکومت کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، قابل نفرین جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایک مستبد جو اپنی تنہا خواہش سے حکمرانی کرتا ہے۔ بلاشبہ بعض اوقات ناخوشگوار نتائج کا باعث ہو سکتا ہے، لیکن اگر وہ جمہور کی مرضی سے حکومت کرتا ہے تو اس کا کوئی علاج ممکن نہیں اس سے قبل کہ افواج روما نے ساری دنیا پر امن کی بخشش کی صرف وہی قومیں خوشحال تھیں جن پر ایک ذہین و مستبد حاکم فرماں روا تھا۔

ہرمودورس —— لولیاس، میرا خیال تو یہ ہے کہ عمدہ طریق حکومت کا سرے سے وجود ہی نہیں، اور یہ کہ ہم کبھی کوئی ایسا نظام تلاش بھی کر نہ سکیں گے۔ کیونکہ اہل یونان جو بہت سے اعلیٰ خیالات کے موجد و مالک تھے کوئی ایسا طرز حکومت ایجاد نہ کر سکے۔ اس لئے اس مسئلے میں انجام کار کامیاب ہو جانے کی امیدیں منقطع ہو چکی ہیں قابل انکار آثار ظاہر ہوئے ہیں کہ دنیا عنقریب وحشت و جہالت میں مبتلا ہو جانے والی ہے علم، ذہن اور نیکی سے جس قدر سکون و اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر اس تمام میں سے صرف یہی باقی رہ گیا ہے کہ ہم اپنی فنا کے نظارے سے پر اذیت انبساط حاصل کریں تو لولیاس ہمارے لئے خوفناک مشاہدے مقرر ہیں۔

ڑتا ـــــ یہ درست ہے کہ لوگوں کی حیوانیت اور بربریت کی پہنچ کر
خرابیاں ہیں، لیکن ایک عمدہ بیڑے، ایک اچھی فوج اور رکانی

ـــــ!

ہرموودورس ـــــ اپنے آپ کو دھوکے میں ڈالنے سے فائدہ؟
شہنشاہی بربریت کا شکار ہو کر رہے گی۔ لاطینی قائم مزاجی اور یونانی
کے صرف سے جو شہر و آبادیاں ہم بنا کر رہے ہیں، بدمست وحشی انکو
، دیا پامال کر ڈالیں گے انسانی دماغ پر تاریکی چھا جائے گی اور
نا ہو جائے گی۔ کیا کبھی یہ توقع ہو سکتی ہے کہ سر آٹیا کے وحشی
اغوں کو ذہنی کاموں اور دماغی مشاغل کے لئے وقف کریں گے!
یونانی موسیقی و فلسفے کی تربیت اور غیر فانی دیوتاؤں کی پرستش
سکے؟ ہرگز نہیں! ہم لوگ غار کی گہرائی میں پھسلے جا رہے ہیں
! مصر قدیم جو کبھی دنیا کا گہوارہ تھا۔ دنیا کی گور بنے گا۔ سیرافیس
کا دیوتا، فانی انسان کی آخری نیاز قبول کرے گا اور میں اس کا
، پجاری ہونگا!

اس موقعے پر ایک عجوبہ ہستی نے دروازے کا بھاری پردہ ہٹایا
ماوں کے سامنے ایک پستہ قد کوز دپشت شخص نمودار ہو گیا وہ
نیانی وضع کا لباس پہنے تھا۔ کرتا نیلا تھا اور پاجامہ سرخ جس پر
کا کام تھا۔ پفنوتیاس نے پہچان لیا وہ آریائی مرقس تھا۔ اس
نے سے کہ آسمان سے بجلی گرنے ہی والی ہے۔ پفنوتیاس نے دونو
اپنے سر پر رکھ لئے اور اس کا رنگ فق ہو گیا۔ اس محفل شیاطین
سے نہ تو کفار کی کفر بیانیاں متاثر کر سکی تھیں اور نہ فلسفے کے
انہ مکالمے، لیکن اس مرتد نہیں بلکہ اکفر کی موجودگی نے اس کی
ت برداشت کو فنا کر دیا۔ یقیناً وہ اٹھ کر بھاگ جاتا مگر تائیس سے
چار ہوگئیں اور وہ کچھ تو ی محسوس کرنے لگا۔ تائیس کی روح کے اندر

اس نے پڑھ لیا اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ایک ولیہ کامل بننے والی
ہے اس لئے وہ آج بھی اس کی حفاظت کر سکے گی۔ وہ تائیس کا دامن تھام کر نجات
دہندۂ عالم، مسیح سے امداد طلب کرنے لگا۔

نو وارد کے خیر مقدم میں شور مرحبا بپا ہو گیا۔ یہ شخص عیسائیوں کا افلاطون
سمجھا جاتا تھا۔ ہرموودورس نے گفتگو شروع کی:۔

"محترم ترین مرقس، ہم لوگ تمہارے آجانے سے نہایت خوش ہیں،
اور تم آئے بھی خوب وقت پر۔ مسیحی تعلیمات سے ہماری واقفیت اس سے
زیادہ نہیں جو کچھ کہ عام طور پر مدرسوں میں بتایا جاتا ہے۔ اور یہ امر یقینی
ہے کہ تم جیسے مفکر کے تخیلات عمومی خیالات کی طرح نہیں ہو سکتے۔ اس لئے
مسیحیت کے اصول و حکم کے متعلق ہم تمہارے خیالات سننے کے مشتاق ہیں
ہمارا دوست زینوتیمیس، جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، ہمیشہ تخیلات و استعارات
کے معنی و مفہوم کی جستجو میں رہتا ہے۔ وہ ابھی ابھی مقدس پفنوتیاس
سے کتب یہود کے متعلق سوالات کر رہا تھا؛ لیکن پفنوتیاس نے کوئی جواب
نہیں دیا۔ اس پر ہمیں تعجب بھی نہ ہونا چاہئیے! کیونکہ ہمارے مہمان نے
خموش رہنے کا عہد کیا ہے۔ صحرا کے اندر خدا نے اس کے ہونٹوں پر مہر
لگا دی ہے۔ لیکن مرقس، تم مسیحی مجالس ہی میں نہیں بلکہ علوی قسطنطین
کونسلوں میں تقریریں کر چکے ہو ہمیں یقین ہے کہ مہربانی فرما کر وہ
فلسفیانہ حقائق جو عیسوی روایات میں مرکوز ہیں منکشف کر کے ہمارے
تجسس کی تشفی کرو گے؛ اوّلین اصول غالباً ایک خدائے واحد کی
ہستی ہے، جس پر کم از کم مجھے تو اعتقاد ہے؟"

مرقس ـــــ بیشک، برادران مکرم، میں ایک خدائے واحد کو مانتا
ہوں ـــــ معنوعی نہیں بلکہ واحد و لم یزل ـــــ ہر شے کی ابتدا
اور ہر چیز کی مرجع!

نکیاس ـــــ مرقس، ہم سب جانتے ہیں کہ تمہارے خدا نے کائنات کو

پیدا کیا۔ مگر اس کی ذات کو اس کام میں سخت کشمکش سے دوچار ہونا پڑا ہوگا اس کام سے قبل بھی اس کا وجود تھا اور ازل سے تھا۔ از روئے انصاف مجھے اعتراف ہے کہ خدا کے لئے یہ سخت مشکل موقع تھا۔ کیونکہ خدا اگر کمل رہنا چاہتا تو اس سے کوئی فعل سرزد نہ ہونا چاہئے۔ مگر خود اپنی ذات پر اپنا وجود ثابت کرنے کے لئے یہ بھی مستلزم تھا کہ وہ فاعل بھی ہو۔ تم کہتے ہو کہ اس سے ارتکاب فعل ہوا۔ ہر چند ایک کمل خدا کے لئے یہ ایک غیر دانشمندانہ عمل تھا، لیکن تمہارے ہی قول کو تسلیم کئے لیتا ہوں۔ مگر اس کی توضیح کرو کہ تکوین عالم کا کام خدا نے کس طرح شروع کیا اور کیونکر انجام دیا؟

مرقس —— جو لوگ مسیحی نہیں بھی ہیں مگر ہرمو دورس اور زینو تھیس کی طرح اصول علم سے آگاہ ہیں، جانتے ہیں کہ خدا نے خلقت موجودات کو بذات خود کسی واسطے کے بغیر پیدا نہیں کیا: اس کے لئے اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو پیدا کیا اور اس سے تخلیق کائنات کا کام لیا۔

ہرمو دورس —— نہایت درست! مرقس اور اس خدا کے بیٹے کی پرستش ہرمیس، متھرا، اپالو اور مسیح کے مختلف ناموں سے ہوتی ہے

مرقس —— اگر میں اسے یسوع اور نجات دہندۂ عالم کے سوا کسی اور نام سے پکاروں تو یقیناً میں مسیحی نہیں ہو سکتا وہ خدا کا حقیقی بیٹا ہے، تاہم یسوع غیر فانی نہیں، کیونکہ اس کی ایک ابتدا تھی۔ اس خیال کی حماقت کو یسوع اپنی پیدائش سے قبل تھا، نیقیا کے خچروں کے لئے چھوڑ دینا چاہئے —— ایسے ضدی گدھوں کے لئے جو کلیسائے اسکندریہ پر اتھناسیس کے نام سے حکمرانی کرتا رہا۔

اس گفتگو کو سن کر پفنو تیاس کی پیشانی پر کرب کا پسینہ نمودار ہو گیا اور اس نے استغفار کے ذیل میں پیشانی اور سینہ پر صلیبی نشان بنایا مگر اپنی شدید خاموشی قائم رکھی۔

مرقس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

ظاہر ہے کہ ان احمق نیقیائیوں کا عقیدہ خدائے واحد شہنشاہی کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ لوگ خدا کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ناممکن التقسیم صفات میں، شفیع عالم، اپنے بیٹے کو بھی جو تخلیق کائنات کا ذریعہ تھا، شریک کرے۔ عزیز نکیاس عیسائیوں کے سچے خدا کا مذاق اڑاؤ، بلکہ اس کی مثال سوسن صحرائی کی سی سمجھو: خدا نے مزدور کی طرح محنت و مشقت نہیں کی بلکہ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا جس نے موجودات کو بنایا اور پھر اپنی صنعت کی درستی کے لئے خود دنیا میں آیا۔ کیونکہ تخلیق مکمل نہیں کی جا سکتی تھی اور خیر کے ساتھ ضرورتاً شر بھی شامل کیا گیا تھا

نکیاس —— خیر کیا ہے اور شر کسے کہتے ہیں؟

ایک قلیل وقفے کے لئے خوشی چھائی رہی۔ ہرمو دورس نے انگلی اشارے سے کر تفنن و بات کے برتن کی طرف اشارہ کیا جس کی مشک گدھے کی تھی اور جس پر دو ٹوکریوں میں سفید و سیاہ زیتون بھرے رکھے تھے، اور کہنے لگا:۔

"ان زیتونوں کو دیکھتے ہو، رنگوں کا تضاد و تقابل آنکھوں کو معلوم ہوتا ہے اور ہم مطمئن ہیں کہ ان کو ہلکے رنگ ہی کا ہونا تھا اور گہرے رنگ کا لیکن اگر ان زیتونوں کو علم و احساس ملا ہوتا تو ہلکے رنگ کہتے کہ ایک زیتون کو خوش رنگ ہی ہونا چاہئے، اس کے لئے بد رنگ ہونا بات ہے۔ اور بد رنگ زیتون خوش رنگ زیتونوں سے نفرت کرنے لگتے۔ اس سے بہتر فیصلہ کر سکتا ہے کیونکہ وہ زیتونوں کے مقابلے میں اتنا بلند و برتر ہے جتنا کہ دیوتا انسان سے بالا و برتر ہیں۔ انسان چونکہ کا جزوی علم رکھتا ہے اس لئے وہ شر کو شر کہتا ہے مگر خدا کا علم کامل ہے اس لئے وہ شر کو بھی خیر سمجھتا ہے۔ ماشبہ بدصورتی بدصورت حسین نہیں لیکن اگر سب کے سب حسین ہوتے تو یہ کل حسین نہ ہوتا۔ شر کا وجود لازمی تھا؛ جیسا کہ افلاطون ثانی نے جو اول سے اعظم تر

ثابت کیا ہے۔"

یوکرٹیس —— میرا خیال ہے کہ اس گفتگو میں اخلاقیات کو کچھ زیادہ حصہ ملنا چاہئے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شر ایک ایک شر ہے مگر کائنات کے لئے نہیں جس کی لازوال ہم آہنگی کو وہ تباہ نہیں کرسکتا، بلکہ اس گناہگار کے لئے جو اس کا مرتکب ہو اور جس کے لئے یہ ارتکاب ناگزیر تھا۔

کوٹا —— قسم ہے جوپٹر کی یہ ایک اچھا استدلال ہے!

یوکرٹیس —— دنیا ایک اعلیٰ ترین شاعر کا لکھا ہوا حزنیہ ہے (ٹریجڈی)؛ افسانہ ہے اس کے مصنف یعنی خدائے حکیم نے ہم سب کو ایک ایک پارٹ ادا کرنے کے لئے مقرر کیا ہے۔ اگر اس کی مرضی ہے کہ تم ایک بھکاری ہو، ایک شاہزادے کا روپ بھر دیا ایک اپاہج کی صورت بناؤ تو لازم ہے کہ تم اس پارٹ کو اپنی بہترین قابلیت کے ساتھ ادا کرو۔

نکیاس —— یقیناً یہی ہونا چاہئے کہ وہ اپاہج ہیفیسٹوس کی طرح گھسٹے، ایک پاگل سے اجیکس کی تمام حرکات دیوانگی سرزد ہوں، بدچلن عورت فیدرا کی تمام فحش کاریوں کا اعادہ کرتی پھرے، غدار وطن سے دشمنی کرے۔ بدمعاش دروغگوئی سے کام لے اور قاتل خون کرتا پھرے؛ اور جب یہ ڈرامہ کھیلا جا چکے تو تمام ایکٹر —— بادشاہ، قاضی، خونخوار سفاک عصمت مآب دوشیزہ، بے غیرت بیوی، شریف النفس شہری اور بزدل قاتل —— ڈرامہ کے مصنف سے مرحبا و آفرین اور صلہ و انعام میں ساوی طور پر بہرہ ور ہوں!

یوکرٹیس —— نکیاس تم نے میرے مفہوم کو توڑ مروڑ کر ایک حسین دوشیزہ کی کچھل پائی بنا دیا۔ مجھے تم پر افسوس آتا ہے کہ تم دیوتاؤں کی، عدل و انصاف کی اور ابدی قوانین کی طبعی نظرت سے اتنے لاعلم ہو!

زینوتھیمس —— دوستو، میں خیر و شر دونوں کے وجود کا قائل ہوں اور مجھے کامل یقین ہے کہ انسان کا کوئی فعل ایسا نہیں —— خواہ وہ یہودا کا بوسہ ہی کیوں نہ ہو —— جو اپنے اندر نجات کے جراثیم نہ رکھتا ہو۔ شر انسان کی آخری نجات میں ممد و معاون ہے اور اس نہج سے خیر کے اندر سے نکلتا، خیر کی صفت میں شریک ہے: مسیحی مذہب نے اس پہلو کو سرخ بالوں والے یہودا حواری کی روایت میں عمدہ طریق پر واضح کیا ہے۔ جس نے اپنے آقا و مولا (مسیح) کے ساتھ غداری کی اور اسے سلامتی کا بوسہ بھی دیا، اور اپنے اس فعل سے نجات انسانی یقینی کر دی۔ اس لئے میری رائے میں کوئی فعل اتنا بیہودہ اور غیر منصفانہ نہیں ہو سکتا جتنا کہ بالآخر یہ دوزد (ایک حواری مسیح) ملکے پیرووں کی نفرت جو انہیں مسیح کے اس بدنصیب حواری کے ساتھ ہے۔ وہ لوگ یہودا اسکریوطی کے اس بوسے کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ نہیں کرتے جس کی بشارت خود یسوعؑ نے دی تھی، اور جو خود انکے عقیدے کے مطابق نجات انسانی کے لئے ضروری تھا اور یہ کہ اگر یہودا تیس نقرئی سکے نہ لیتا تو فعل ربانی باطل ہو جاتی، پروردگاری پاش پاش ہو جاتی اور خدا کی تمام تجاویز الٹی ہو جاتیں اور جہاں میں شر، جہالت اور موت کے سوا کچھ نہ ہوتا!

مرقس —— یہ علم ایزدی کے اندر تھا کہ یہودا —— ہر چند وہ دغابازی کا بوسہ دینے پر مجبور نہ تھا —— بوسہ دیگا! اور اس طرح خدا نے اسکریوطی کے گناہ کو تعمیر نجات میں ایک اینٹ یا پتھر کی طرح استعمال کیا۔

زینوتھیمس —— مرقس، میں نے ابھی کہا کہ انسان کے گناہوں کا کفارہ مسیح کے مصلوب ہونے سے ہو چکا ہے! اس لئے کہ میں جانتا ہوں یہ مسیحیوں کا ایمان ہے۔ اور اس خیال کو جس نے اپنا یا کہ اس سلسلے کہا کہ جو لوگ یہودا کو ورطۂ لعنت کا مستوجب اور [illegible]

بہتر عنوان کے ساتھ ثابت کرسکوں، لیکن فی الواقع، میری نظر میں یسوع، بھی تیدیس اور ویلینٹی نس کا ہیش رو یا علمبردار تھا۔ اب رہا مسئلۂ نجات کا راز تو میرے دوستو، اگر تم معلوم کرنے کے مشتاق ہو تو میں بتا سکتا ہوں کہ اس دُنیا میں نجاتِ انسانی کیونکر حاصل کی گئی۔

تمام مہمانوں نے خواہش ظاہر کی بارہ زہرہ اور مشتری لقا کنواریاں، سروں پر فواکہ کی قابیں اُٹھائے اس طرح داخل ہوئیں جیسے ایتھنز میں سیریس (مادرگیتی) کی قربان گاہ کے لئے ہدئے اور نذرانے لے کر حاضر ہوتی تھیں؛ اور اس دیوی کی مقبول نظر اور اس طرح مقدس ہو جاتی تھیں۔ اُن کی سبک خرامی ایک رقص مستقل تھی اور نگاہوں سے مخفی بانسری سنگت دے رہی تھی۔ قابیں میز پر رکھدی گئیں اور نغمہ نے موقوف ہو گیا اور زینوتھیمیس نے کہنا شروع کیا:-

• جب یونویا یعنی مشیت خداوندی کائنات کو پیدا کر چکی تو اسنے زمین کی حکومت ملائکہ کو سپرد کر دی۔ لیکن حکمراں فرشتے اپنے حلم و وقار کو قائم نہ رکھ سکے جو شایانِ فرماں روائی ہے۔ حوا کی بیٹیوں کا حسن زہد شکن و اتقا سوز اُن کے لئے نئی اور بے پناہ چیز ثابت ہوا اور اسکی حقیقتیں بشدت محسوس ہونے لگیں۔ چنانچہ یہ فرشتے شام کے وقت پنگھٹوں کی طرف نکل جاتے اور نوشباب پنہاریوں کے جھرمٹوں کو جو اشک عقدِ پروین و ثریا ہوتے تھے، حیرت زدہ کر دیتے اور اُن کو چھیڑا کرتے تھے؛ اور بالآخر سلسلۂ تعشق و تزویج کی بنا پڑ گئی۔ ایسے رشتوں سے جو نسل پیدا ہوئی وہ نہایت تند مزاج تھی اور اُس نے دُنیا کو فسق و فجور اور ظلم و نا انصافی سے بھر دیا۔ اس صورت حال سے یونویا کو سخت صدمہ ہوا۔ اُس نے دنیا کی طرف رجوع کر کے متالم و متاسفانہ لہجے میں کہا:-

"دیکھتے ہو، میں نے کیا کیا؛ میرے غریب بچے آفات و آلام میں مبتلا ہیں! یہ سب میرا قصور ہے؛ ان کی مصیبت میرا جرم ہے؛ میں اس کا کفارہ دوں گی: خود خدا بھی جو میرے ذریعے سے سوچتا ہے، ان ملائکہ کو اگلی سی پاکیزگی نہ دے سکے گا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا ہے؛ اور اب مخلوق تا بہ ابد ناقص رہے گی۔ لیکن کم از کم میں اپنے بچوں کو فراموش نہیں کر سکتی اگر میں انھیں اپنی ہی طرح شاداں نہیں بنا سکتی تو اپنے آپ کو تو ناشاد رکھ سکتی ہوں۔ چونکہ یہ میری غلطی تھی کہ اُن کو اس قسم کے جسم دئیے جو بے توقیری کا باعث بن گئے، اس لئے میں خود بھی وہی جسم اختیار کر کے اُنکی مصیبتوں میں انھیں کیا تھ بود و باش رکھوں گی!"

یہ کہہ کر یونویا دنیا میں اُتر آئی اور آرگوس کی ایک عورت کے ... سے، عورت ہی کی شکل و صورت اختیار کر کے اس دنیا کی زند... شریک ہو گئی وہ نہایت لغتہ ولکز ور پیدا ہوئی تھی۔ اس کا نام ہ... رکھا گیا۔ وہ اس زندگی کی تمام کلفتیں اور مشقتیں برداشت... رہی مگر جلد ہی جلوہ و رعنائی کا پیکر بن کر بڑی ہوئی غیر... اور ندامت مشتری بن کر بڑی ہوئی۔ اس کی زہرائیت تمام عو... زیادہ مجبوب مقبول تھی۔ اُس نے اپنے لئے یہی تجویز کیا کہ اُس کا فانی سخت سے سخت آلودگیوں کی آزمائشوں سے گزرے۔ ج... جب وہ جوان ہوئی تو دنیا بھر کی نفس پرستیوں اور ہوس... کا ایک صید مجہول بن گئی؛ اُس کی عصمت جبریہ بگاڑی گئی او... ساتھ زیادتیاں کی گئیں۔ غرض کثرت معصیت اور اس کے ت... اُن کے اعادہ و تکرار سے، یونویا اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر... اس کا شباب شعلہ ساماں بہت سی قوموں کی تباہی کا... ہوا۔ اور محض اس لئے کہ خدا دنیا کے گناہوں کو بخش دے ا...

تمام بداخلاقیوں اور سیہ کاریوں کا تجربہ کیا۔ شیت ساوی، یوتوپیا، جن دنوں ایک عورت کے جنم میں چرواہوں اور قوم کے ہیروؤں سے ہوس کاری کی مرتکب ہوتی پھرتی تھی اس کی جوانی کی سحر سازیاں اور اسکی حسن کی طلب پرستش نقطۂ کمال پر تھی۔ شعرا کو اس کی ہستی کی تمثیلات کا الہام ہوا، انھوں نے اس کی تعریف و توصیف میں قصیدے لکھے اور اس کو سکون، شان و تجمل اور ملاکت سے ملو بیان کیا۔ دعاؤں میں اس فقرے کا اضافہ کیا۔

"ایسی روح جو سمندر پر چھائے ہوئے سکون کی طرح سلیم ہو!"

"صلۂ رحم کے لئے یوتوپیا نے بدی اور رنج و غم کو اپنا اوڑھنا لیا تھا ——— اور پھر وہ مر گئی۔ اس کی قبر اب تک نمائش گاہِ خلائق ہے ——— کیونکہ مستلزم تھا کہ وہ حرص و ہوا کی زندگی کے بعد موت کا مزا بھی چکھے؛ اپنے لگائے ہوئے درخت کے پھلوں کی تلخی بھی پہچانے۔ لیکن ہیلن کے سڑے گلے گوشت و پوست میں سے اُس نے پھر ایک عورت کا جنم لیا اور پھر ہر قسم کی توہین و تذلیل کا ملجا بنی۔ غرض اسی طرح وہ ایک جسم سے دوسرے جسم میں، ایک جنم سے دوسرے جنم میں، بدکار زمانے سے گزرتی ہے اور دنیا کے گناہوں کا کفارہ ادا کرتی رہتی ہے۔ اُس کی قربانی و ایثار بے اجر نہ رہے گا۔ گوشت و خون کے رشتے سے انسانیت میں مدغم ہوتے ہوئے، انسان سے محبت کرتے ہوئے، انسان کے ساتھ اشکِ غم بہاتے ہوئے وہ اپنی اور ہماری نجات حاصل کرے گی؛ اور ہمیں اپنے سفید سینے سے چمٹائے ہوئے بازیافتہ بہشت کے امن و سکون میں پھر سے پہنچے گی!"

ہرموڈورس ——— یہ روایت میں نے بھی سُنی ہے کہ ساوی ہیلن اپنے کسی ایک جنم میں شہنشاہ ٹائبریس کے عہد میں، ساتون ساحر کے ساتھ رہتی تھی۔ بہرحال میرا خیال تھا کہ اُس کی یہ تباہی ارادی و خود اختیاری نہ تھی۔ بلکہ فرشتے مردود ہو کر اسے اپنے ساتھ گھسیٹ لائے تھے۔

زینوتھیمس ——— ہاں ہرموڈورس، یہ بھی درست ہے؛ کیونکہ جو لوگ دانایانِ راز میں سے نہیں ہیں یہی سمجھتے ہیں کہ غمزدہ یوتوپیا اپنے زوال کی خود ذمہ دار نہ تھی۔ لیکن اگر اُن کا خیال صحیح ہوتا تو یوتوپیا ایک کفارہ گزارِ فاحشہ کیوں ہوتی؟ یہ ہر قسم کے داغوں سے آلودگی نہ ہوتی، یہ روح ہماری شرم و ندامت میں ڈوبی ہوئی نہ ہوتی؛ یہ چڑھاوا لذت اندوز نہ ہوتا؛ یہ بے مثال ایثار اور یہ عظیم قربانیاں بھی نہ ہوتیں جنکی لپٹیں زمین سے بلند ہو کر آسمانوں کو مہکا رہی ہیں! اگر یہ سب کچھ اختیاری نہ ہوتا تو اس کی معصیت میں کوئی خوبی و ندرت نہ ہوتی!

کلیکراٹیس ——— زینوتھیمس، کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ یہ جود بالتسلسل ہیلن آج کس نام سے، کس اندام دلفریب میں اور کس حصہ زمین پر تراوش لذات کر رہی ہے؟

زینوتھیمس ——— اس راز کا انکشاف کسی نہایت ذی ہوش و صاحبِ بصیرت آدمی کا کام ہے اور کلیکراٹیس، شعرا کو تو عقل و خرد سے بہرہ نہیں، وہ تو ایک ناتراشیدہ جہان اشکال میں، بچوں کی طرح بے معنی صداؤں اور بے نتیجہ نمائشوں میں رہتے ہیں!

کلیکراٹیس ——— مگر زینوتھیمس کہیں دیوتا تم سے خفا نہ ہو جائیں کیونکہ شعرا دیوتاؤں کے محبوب و مقبول ہیں۔ خود دیوتاؤں نے اولین قوانین نظم ہی میں نازل کئے تھے کہن (Oracles) بھی شعر ہی کی صورت میں ہوتی ہیں۔ ساوی سامعہ کو نغمہ و ترنم مرغوب ہے۔ کون نہیں جانتا کہ شعرا پیغمبر ہوتے ہیں اور اُن سے فطرت کا کوئی راز مخفی نہیں ہوتا؟ خود ایک شاعر ہونے اور اپالو کے طرۂ امتیاز کا فخر حاصل

ہونیکے لحاظ سے، میں دُنیا کو بتا سکتا ہوں کہ وینس آج کہاں اور کس روپ میں ہے یہ وہ ماہی ہیلن کیطرح نہیں ہے۔ وہ ہمیں بخیۂ ہی ہے اور ہم اُسے دیکھ رہے ہیں۔ آپ اس عورت کو دیکھتے ہیں جو اپنی کوچ پر ریشمی تکیوں میں صرف راحت ہے — اتنی حسین اور اتنی متاہل — جس کے لبہائے صہبا ریز بوسوں کے خزانے اور جس کی آنکھوں کی سپیاں مروارید تمنا کے سرچشمے ہیں، یہی وینس ہے! ویسی ہی جیسی پریام کے زمانے اور ایشیا کے عہد مسرور میں تھی! آج وینس کا نام تائیس ہے!

فلینا — کلیکراتیس تم نے کیا کہا؟ کیا ہماری تائیس پرس فیلاس اور اہل اشانیا کو جو ایلیان کے میدانوں میں نبرد آزما ہوئے تھے، جانتی ہے؟

تائیس، ٹرائے کا گھوڑا کتنا بڑا تھا؟

ارستوبولس — گھوڑے کا ذکر کس نے کیا؟

"آج تو میں نے تھریس والوں کیطرح پی ہے" کیریاس نے کہا اور میز کے نیچے گر گیا

"اگر ہم نہ پیئیں گے" کلیکراتیس نے کہا۔ "تو ہماری موت یقیناً تمام سے محروم رہے گی"

بوڑھا کوٹا خواب زرشتیکے منہ سے لے رہا تھا اُسکے چوڑے شانوں پر جھکا سر ہلنے لگا۔

دریان جو جوش ہیجان کی حالت میں تھا۔ اپنے فلسفیانہ لباس میں لڑکھڑاتا ہوا تائیس کی کوچ تک پہنچکر کہنے لگا۔

"تائیس، اگرچہ کسی عورت سے الفت کرنا مجھے شایاں نہیں لیکن مجھے تجھ سے محبت ہے"

"لیکن اس وقت تک کیا کرتے رہے اور یہ سے پہلے تمہیں مجھ سے محبت کیوں ہوئی"

تائیس نے جواب میں کہا

دریان — اس لئے کہ میں اس وقت تک کھانا کھا رہا تھا!

تائیس — لیکن میرے دوست، میں نے سوائے پانی کے اور کچھ نہیں پیا ہے اس لئے میں محبت کرنیکے حال میں نہیں اور معذرت چاہتی ہوں۔

دریان جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی چلدیا اور دروسیا کی جانب متوجہ ہو گیا، جسے ابھی تائیس کے پاس سے ہٹا لینے کے لئے اتنے سے بلایا تھا۔ زینوتھیمس جسکی خالی کی ہوئی جگہ پر آ بیٹھا اور تائیس کے لبوں کا بوسہ لیا۔

تائیس — میں تمہیں اس سے زیادہ با اخلاق سمجھتی تھی۔

زینوتھیمس — میں کامل ہوں اور کامل کسی قانون کے ماتحت نہیں ہوا کرتے۔

تائیس — لیکن تمہیں اندیشہ نہیں کہ تمہاری کامل روح ایک عورت کی آغوش میں ملوث ہو جائیگی؟

زینوتھیمس — روح کو متاثر کئے بغیر بھی جسمانی خواہشیں پوری کیجا سکتی ہیں!

تائیس — تو تشریف لیجائیے میں روح و جسم، دونوں کیساتھ محبت کیا جانا پسند کرتی ہوں یہ تمام فلسفی بوڑھے بکرے ہیں!

ایک ایک کرکے شمعیں گل ہوتی گئیں۔ پردوں کے چاک سے نکلکر صبح صادق کی روشنی ترکائے جشن کے بےرنگ چہروں اور پھولی ہوئی آنکھوں پر پڑ رہی تھی کیریاس کے پہلو میں ارستوبولس، بےخبر پڑا سو رہا تھا اور خواب میں اپنے شکاریوں سے زاغ صحرائی کی تلاش کرا رہا تھا۔ زینوتھیمس کی آغوش، دلدار و دلنواز فلینا سے رشک گلزار بنی ہوئی تھی دریان، دروسیا کے بجیح وگداز سینے پر شراب احمریں کے قطرے، جس طرح مرمر پر عقیق لٹتے ہوں ٹپکا رہا تھا وہ ہنس رہی تھی کیونکہ سرشار فلسفی سینے کے زیر و زبر ہونے سے ڈھل ملتے ہوئے قطروں کو اپنی زبان سے چن لینا چاہتا تھا۔ یوکریٹس اپنا ہاتھ نکیاس کے کاندھے پر رکھ کر کھڑا ہوا اور راستے ایوان کے آخری گوشے میں لے گیا اور پھر مسکرا کر کہنے لگا۔

"دوست، اگر ہنوز سوچنے کی حالت میں ہو تو بتاؤ کس خیال میں ہو؟"

"میں غور کر رہا ہوں کہ عورت کی محبت اڈونس کے چمن کی طرح ہے"

"اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"تمہیں نہیں معلوم کہ عورتیں اپنی چاندنیوں پر مختصر سے چمن سجاتی اور وینس کے عاشق کے اعزاز میں، چھوٹے چھوٹے گملوں کے اندر خوبصورت پودے لگاتی ہیں؟ یہ پودے قلیل وقت کے لئے پھولتے اور پھر مرجھا جاتے ہیں"

"لیکن آخر اس کا مفہوم کیا ہے: یہ کہ کسی ایسی بات کو اہمیت دینا جو تھوڑی عرصے کے لئے پھولتی ہو یا جلد پژمردہ ہو جاتی ہو حماقت ہے!"

"نہیں اس کے برعکس، اگر حسن سایہ ہے تو شوق بھی چمک برق ہے

زیادہ نہیں! پھر یہ حماقت کیونکر ہوئی کہ حسن کی آرزو کیجائے، بلکہ یہ ایک معقول بات ہے کہ جو شے آنی جانی ہے وہ ایسی ہی چیز کی جستجو کرے جسے قیام ہیں: بجلی کو سیماب ہی سے معانقہ کرنا چاہئیے"!

"نکیاس، تمہارا استدلال بچوں کا انگلی بھول کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ میری بات مانو اور علائق سے آزاد ہو جاؤ۔ صرف آزاد ہو کر ہی تم صحیح معنے میں انسان بن سکو گے"۔

"ایک انسان، اس جسم کے ہوتے ہوئے، کس طرح آزاد ہو سکتا ہے؟" نکیاس نے اعتراضاً کہا۔

مگر یوکرٹیس ایک ستون سے لگا کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر نورِ صبح کی شعاعیں پڑ رہی تھیں ہرمودورس اور مرقس، نکیاس کے برابر کھڑے تھے۔ اس طرح یہ لوگ مابعد الطبعیات پر گفتگو کرنے لگے اور ادھر صحبت میگساراں کے قہقہے بلند تھے۔ یوکرٹیس نے اپنے خیالات کا اظہار نہایت دلنشین انداز میں کیا اور مرقس سے کہا:۔

"انسان کو سچے خدا کا علم سزاوار ہے!

"سچا خدا ہر صاحب ہوش انسان کے دل میں ہے" یوکرٹیس نے جواب دیا

پھر موت کا ذکر چھڑ گیا اور یوکرٹیس نے کہا:۔

"میری آرزو ہے کہ موت جب میرے پاس آئے تو مجھے اپنی غلطیوں کی اصلاح میں مصروف پائے، اپنے فرائض کے بجالانے میں مشغول دیکھے اور موت کی موجودگی میں، میں ہاتھ بلند کرکے دیوتاؤں سے کہوں کہ مقدس دیوتاؤ! تم نے اپنے جو تصورات میرے دل کے اندر رکھ دئیے تھے میں نے انھیں ملوث نہیں کیا ہے؛ میں نے ان پر اپنے جذبات کے گجرے اور مالائیں چڑھائی ہیں، میں نے تمہاری خداوندی کے مطابق زندگی گزاری ہے؛ میں کافی جی لیا ہوں!" یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ بلند کئے اور چند لمحے تامل کیا، پھر جوش مسرت کے ساتھ سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"یوکرٹیس! اس پختہ زیتون کی طرح جو شاخ سے جھڑ پڑتا ہے تو بھی اپنے آپ کو زندگی سے الگ کر لے!"

اور پھر قمیص کی تہ میں سے ایک برہنہ خنجر نکالکر اپنے پہلو میں پیوست کر لیا۔ جو لوگ پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے جھپٹے کہ ہاتھ پکڑ لیں، مگر فولاد کی انی فلسفی کے پہلو میں ڈوب چکی تھی۔ اور یوکرٹیس آزاد ہو چکا تھا دائمی راحت حاصل کر چکا تھا۔ ہرمودورس اور نکیاس نے خونچکاں لاش کو اٹھا کر ایک کوچ پر لٹا دیا۔ ایوان پر صبح جشن کی بے رونقی وافسردگی تو پہلے ہی سے چھائی ہوئی تھی، اب صنف نازک کی چیخیں، سرمستانِ صہبا کے خراٹے اور ماں بیٹے (دیمنی جیوپڑ) کی خدائی ماننے والوں کا شدید تنفس، جو پردوں کی آڑ میں نیم مستور تھے، یہی آوازیں تھیں جن سے فضا معمور تھی۔ کوٹا ایک پرانا سپاہی تھا اس کی نیند سونے والا اٹھا، لاش کے قریب آیا اور زخم کو دیکھکر پکارا:۔

"میرے ڈاکٹر ارسٹائیس کو بلاؤ"!

نکیاس نے گردن ہلائی:۔

"یوکرٹیس زندگی کا ختم ہو چکا ہے۔ اسے موت کی ایسی آرزو تھی جس طرح لوگ محبت کی تمنا کرتے ہیں ہم سب کیطرح اسنے بھی اپنی ناقابلِ بیان آرزو کی تعمیل کی۔ اور اب وہ دیوتاؤں کی مثال ہے جن کو کوئی خواہش نہیں ہوتی"!

کوٹا نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہنے لگا:۔

"مرنے کی خواہش! جبکہ وہ ہنوز حکومت کی کوئی خدمت کر سکتا تھا، کیسی حماقت ہے"!

پفنوتیاس اور تائیس پاس پاس بیٹھے ہوئے خوشی کیساتھ سب کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل تنافر، خوف اور امید سے لبریز تھے۔

دفعۃً راہب نے اکٹریس کا ہاتھ پکڑ لیا اور مدہوش پڑے ہوؤں کو پھاند کر خون اور شراب سے آلودہ فرش پر گزرتا ہوا مکان سے باہر نکل گیا۔ (باقی)

ل۔ احمد اکبرآبادی

دورِ محبت

عالمِ ہوش و خرد میں حشر برپا کیجئے — دیجئے درسِ جنوں ذرّے کو صحرا کیجئے
ہوش کی دُنیا میں رُوحانی مسرت ہی کہاں — عشق کی بنیاد پر تعمیرِ دُنیا کیجئے
انحصارِ عالمِ فردا ہے سعیِ حال پر — حال میں رہتے ہوئے کیوں فکرِ فردا کیجئے
کیوں رہے دورِ محبت میں کوئی تیرہ نصیب — آئیے بزمِ تصوّر میں اُجالا کیجئے
حُسن کے جور و جفا پر ہے سرِ تسلیم خم — یہ کہاں کا پاسِ اُلفت ہے کہ شکوہ کیجئے
ہے یہی تو در حقیقت حاصلِ سعیِ جنوں — سامنے وہ ہوں اُنھیں تا عمر دیکھا کیجئے
دل عدوئے ضبط ہے اور آنکھ ہے غمّازِ دل — کس کو اپنا جانئے کس پر بھروسا کیجئے
ہو نہ جائے منکشف دُنیا پہ رازِ بیخودی — مست آنکھوں سے مری جانب نہ دیکھا کیجئے
سوز اصلِ کیفِ نغمہ، سوز رازِ زندگی — جس طرح ہو سازِ دل میں سوز پیدا کیجئے

پھونکئے اپنے ضیا کے دل میں رُوحِ عاشقی
اور پھر اُس کو سرِ بازار رسوا کیجئے

ضیا فتح آبادی

سحرِ معنیٰ

آج سے ڈیڑھ سو (۱۵۰) سال پہلے کی ایک قلمی مثنوی

مثنوی "سحرِ معنیٰ"، مولوی غلام امام ابن ولی اللہ ابن محمد علی نبیرۂ شیخ خیرالدین ابن خیراللہ العمری گوپاموی کی تصنیف ہے۔ مصنف میر و سودا کے ہم عصر تھے [illegible]ھ میں انتقال کیا۔ آپ کی نعش لکھنؤ سے وطن لائی گئی۔ اور مقبرہ شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ میں سپردِ خاک کی گئی۔

مولوی غلام امام اس خاندان کے فرزند ہیں جس میں افضل العلما قاضی ارتضا علی خاں گوپاموی اور مولوی مجتبیٰ علی خاں خوشدل جیسے لوگ پیدا ہوئے خان بہادر مولوی مفتی انعام اللہ صدیقی وکیل صدر نظامت سے آپ کی قرابت قریبہ تھی۔ آخر عمر میں نواب شجاع الدولہ کے دربار میں منسلک ہو گئے تھے

یہ مثنوی مولوی انتظام اللہ الصدیقی اکبرآبادی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ روشِ تحریر اور کاغذ وہی ہے جو اُس زمانے کی دوسری قلمی کتابوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ مثنوی کے صفحات جابجا کرم خوردہ ہیں۔ دو ایک جگہ الفاظ قطعاً پڑھے نہیں جاتے۔ مثنوی کے بعض اشعار بحر سے خارج ہیں۔ اور بعض الفاظ اس قدر شکستہ و پیچیدہ لکھے ہوئے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتے میں نے بمشکل ان الفاظ کو سیاق عبارت سے اُبھارا ہے۔ لیکن کسی شعر میں تصرف نہیں کیا ہے حتیٰ کہ جو مصرعے ساقط البحر ہیں وہ بھی علیٰ حالہٖ چھوڑ دئے گئے ہیں۔ مثنوی مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔ جیسا کہ اُن آخری سطور سے واضح ہوتا ہے جو ختم مثنوی کے بعد راقم مثنوی نے ثبت کی ہیں۔

"تمام شد مثنوی سحرِ معنیٰ من تصنیف مشفقی میاں غلام امام صاحب سلمہ الواہب"

"ابن شیخ ولی اللہ ساکن بسوہ برائے خاطر فضل علی صورت ترقیم پذیرفت"

ساکن کے بعد جو لفظ ہے وہ صاف نہیں پڑھا جاتا بسوہ۔ یا بسوہ۔ خدا جانے کیا ہے! قیاس غالب یہ ہے کہ شاید یہ لفظ "بسوہ" ہی ہے اس لئے کہ مصنف نے مثنوی کے ایک شعر میں اسے نظم بھی کیا ہے ؎

کہیں بسوہ کی چھائی، نگیاں ہیں　　　عجائب طرز کی پھلکاریاں ہیں

مثنوی کی زبان وہی زبان ہے جو بارہویں صدی ہجری میں مروج تھی۔ مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی کسی کوٹھی کے افتتاح پر لکھی گئی تھی۔ جسے نواب وزیر الملک آصف الدولہ نے لکھنؤ میں بنوایا تھا۔ اس مثنوی میں جلوس کا نظارہ دکھایا گیا ہے اُس زمانے میں کپڑوں کے جو نام مروج تھے مثنوی میں بڑی تفصیل سے انہیں نظم کیا گیا ہے مثلاً مشروع۔ مشجر۔ تن صاف۔ شبنم۔ دھوتر۔ اطلس۔ بیلامہ۔ گلبدن۔ کرنجی۔ دھوپ چھاؤں (دھوپ چھاؤں)۔ جامدانی۔ دارائی۔ رومی۔ زربفت۔ صحن۔ ڈوریا۔ نوالی شالتہ خانی۔ لاہی۔ قندز۔ قاقم۔ دشتی۔ قصب۔ سیفور۔ شتالی۔ مونی۔ نگیاں۔ ساٹھن۔ چار خانہ۔ ململ۔ تنزیب۔ نرگس منقش۔ کمخواب۔ سنجاب۔ [illegible]۔ چینا تارا۔ تامی وغیرہ۔ ان میں سے بعض کپڑوں کے نام اب بھی رائج ہیں۔ اور بعض متروک یا منسوخ ہو چکے ہیں۔ شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے مثنوی کا درجہ بلند نہیں ہے لیکن نقل کرنے والے کسی غیر شاعر کی قلمکاریوں نے اس کی حقیقی صورت کو بگاڑ دیا ہے [illegible] مثلاً مثنوی سے یہ اشعار ؎

محمد وہ مکاں سے لامکاں سب　　　[illegible]

[illegible]　　　[illegible] شمع احمد [illegible]

جو مانی دیکھتا [illegible]　　　تو ب ثبک ہوں جاتا [illegible]

[illegible] ہے کہیں [illegible]　　　کسی جا [illegible] جبت [illegible]

کوئی شہروں میں اب اک [illegible]　　　[illegible] [illegible]

کہیں ململ، کہیں تنزیب [illegible]　　　کہیں نرگس منقش [illegible]

[illegible] میں کیا لکھوں جو کچھ [illegible]　　　[illegible] میں [illegible]

[illegible]　　　منقش [illegible] اسوب [illegible]

[illegible] عشق [illegible] آئے　　　تو چیٹھوں سے کئی دریا بہا ئے

[illegible] بادپا [illegible]　　　جھلا جھل جھلکتی تھی مثل پردیں

کہیں باعتبار صرف و نحو کہیں باعتبار وزن غلط ہیں لیکن جب تک اصل مثنوی کو نہیں پہنچ سکے مصنف کو ان غلطیوں کا مرتکب ٹھہرانا غلط ہے۔

مثنوی "سحر عشق" میں وہ تمام الفاظ جو اُس وقت دہلی میں [illegible] تھے اور آج متروک ہیں موجود ہیں مثلاً۔ زور (درج زور بہت زیادہ کے معنوں میں مستعمل تھا میرا اثیر اکبر آبادی نے بھی [illegible] استعمال کیا ہے۔ مگر اس کے بعد پھر کسی نے اس معنی میں نہیں لکھا)۔ تس ادپر (یہ سے اُسپر) دے (بجائے وہ)، رہنیو (بجائے رہنا)، ذکی (بجائے اُنکی)، دس (بجائے اُس)، جھونکر (بجائے جھوم کر) چلوں (بجائے چلیں) مرحبا (بجائے [illegible]) پھلکاریان (بجائے پھلواری) وغیرہ وغیرہ۔

با اینہمہ چونکہ مثنوی "سحر عشق" بارہویں صدی کے نصف آخر میں لکھی گئی ہے اسلئے اُس عہد کی ایک اچھی یادگار ہے۔

سیماب اکبر آبادی

الٰہی پردۂ صورت اٹھا دے جمالِ شاہدِ معنیٰ دکھا دے
پریشاں خاطری سے ہوں میں غافل عطا کر مایۂ جمعیتِ دل
کٹی غفلت میں میری عمر یارب ترا فضل و کرم درکار ہے اب
ہوئی طفلی بسر لہو و لعب میں جوانی بھی چلی عیش و طرب میں
رہے غافل ہی عن نہی و سہو صرفت العمر فی لعبٍ و لہو
نہ کچھ بھی قول و فعل اپنا نباہا فآہا ثم آہا ثم آہا
گئے سب جان سے ساتھی ہمارے رہے گردش میں ہم غفلت کے مارے
حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند
رہائی دے مجھے دنیا کے غم سے بہت عاجز ہوا ہوں اس الم سے
شتابی کر مجھے از فضلِ س۔ بد غلامِ حضرتِ آلِ محمدؐ
محمدؐ ۰۰ مکاں سے لامکاں تک ظہور اس کا وہی ہے مظہرِ رب
محمدؐ وہ کہ حق ہیں جن کے لولاک کہا اللہ نے با عز و ادراک
خدا جس کی ثنا میں آپ بولے بشر کو تاب کیا واں لب جو کھولے
سخن کو دی مرے شیریں کلامی بفیضِ احمدؐ استادِ نامی
سخن وہ طبع کو میری عطا کر چلا جاؤں بشرعِ احمدیؐ پر
سخن کے جوہری صاحب سخن ہیں سخن کے مشتری سب اہلِ فن ہیں
سخن کا ہے ہمیشہ گرم با ذار سخن کے ہیں بہت دانا خریدار
ارے ساقی تو اٹھ اسدم شتابی محبت کی مجھے بھر دے گلابی
محبت کے نشے سے کر تو سرشار محبت کے مزے سے کر تو ہشیار
محبت دے مجھے خیر البشرؐ کی محبت دے مجھے اثنا عشر کی
محبت دے تو اصحابِ نبیؐ کی کہ تھی حب ان کو اولادِ علیؑ کی
محبت کا شجر نت بارور ہے محبت میں حلاوت بیشتر ہے
محبت سے ہے یہ شیریں کلامی محبت سے ہوا فرہاد نامی
محبت رکھتی ہے اتنک یہ تاثیر کہ بن مجنوں نہ ہو لیلیٰ کی تصویر
محبت ہے شرابِ بے کدورت محبت ہے محبت ہی محبت

کیا تحقیق ہم نے خوب واللہ   محبت تخم ہے باقی ہمہ کاہ

عجب خطہ ہے لاہور پر گلزار   کہ جس کا ہے مجا شاہ نمودار
ثنا جو کچھ کہوں سو سب بجا ہے   بجا ہے مجتبیٰ ہی جا بجا ہے
یہ بخشی حق نے اس کے در کی تاثیر   کہ ہر یک خاک کو سمجھے ہے اکسیر
کئی بیٹے وہاں ہوتے ہیں ہر بار   عجب درگاہ ہے اللہ اللہ
جو حاجت مند اس درگاہ جاوے   توکل مقصد کو بھر دامن میں لاوے
کہاں تک میں کہوں اس در کی خوبی   کرے خورشید جس کی خاکروبی
سب بیشک جو کہ مقبول خدا ہے   خدا ہرگز نہیں ان سے جدا ہے
محمد مہدی آنجا مقیم است   کریم ابن الکریم ابن الکریم است
خدا رکھے انہیں دائم سلامت   وہی ہادی ہے میرا با ہدایت
الٰہی از طفیل شاہ [illegible]   رہیں دل شاد میرے سب محبان

گریباں صبح نے جس دم کیا چاک   ہوا روشن زمیں سے تا بہ افلاک
[illegible] نے بازو کر آئی   کیا قبضے میں [illegible]
پڑا بیخود جو میں سوتا تھا سرشار   سن آئی مرے کانوں میں یکبار
کہ اٹھ اے بیخبر اتنی بھی تاخیر   تماشا دیکھنے کی کر تو تدبیر
عجائب سیر ہے اللہ اللہ   [illegible]
اٹھا میں خواب غفلت سے جو ناگاہ   چلا اٹھ کر شتابی [illegible]
جو دیکھا [illegible] تھا کر سوت بازار   نظر آیا عجائب رشک گلزار
دوکاں ہر ایک رنگا رنگ رنگی   نظر پڑتے ہیں حیران فرنگی
مصور نے بھی رنگا رنگ تصویر   در و دیوار پہ کھینچی ہے تحریر
کہیں معشوق و عاشق کی ہے اشکال   کہیں لیلیٰ و مجنوں کی ہے تمثال
کہیں کشن اور کنہیا جی کی صورت   کہیں لچھمن کہیں [illegible] وہاں مورت
کہیں لوکا کی منسی بجا [illegible]   کہیں سکھی اور سہیلی کو رجھاویں

کہیں دیکھو تو دریا کی ہیں لہریں
کہیں تو جا بجا جاری ہیں نہریں
کہیں کشتے کہیں چنو نوا رٹے
کہیں ہیں جش کے ہر سو کوا رٹے
جو بینائی ہو تو کر لے نظارہ
ہر اک ذرہ میں ہے خورشید پارہ
شعاع مہر و مہرویاں سے ہر آں
چمکتی ہے سو ہے دہمن کی دوکاں
جو مانی دیکھتا سبز و سرخ رنگ
تو بیک بھول جاتا اپنا ارژنگ
سنہری ہے کہیں دوکان و درب
کسی جا نقرہ و رجہت مذہب
سنہری برج سے تا اکبری در
چمکتے ہیں در و دیوار یکسر
یہاں کیوں کر نہ حیراں ہو خریدار
مرقعہ کا یہ عالم سب ہے بازار
مکاں جس جس کسی کا ہے سر راہ
کہیں کیا اس کی کیفیت کو اللہ
کہ دی ہے ڈال چلون اپنے در سے
نظارہ کر رہی ایدہر او دہر سے
جہاں تک بی بیاں ہیں پردہ والی
انھوں نے جالی اور کھڑکی نکالی
غرض جو صاحب عصمت ہیں عورات
سبھی کرتی ہیں وے ہر دم مناجات
الٰہی غنچہ امید بکشا
گلے از روضۂ جاوید بنما
دو طرفہ جو کہے ہیں سائے کے اشجار
کہوں کیا اس کی کیفیت بتکرار
تر و تازہ وے ہیں ہر دم لہکتے
برنگ کلکی خوشبو سے مہکتے
ہر اک کوٹھی پہ رنگا رنگ عالم
کہیں گل ہے کہیں ہے خار باہم
کہیں کوٹھی پہ رقص لولیاں ہے
کہیں تو سوز و ساز مطرباں ہے
کوئی کوٹھی پہ لونڈی کو نچاتا
کسی کو ناچ کشمیری کا بھاتا
کہیں کسبی کہیں ناچیں عطائی
ہر اک نے شکل یک اپنی بنائی
کوئی مرچنگ و شہنائی بجاوے
کوئی بیٹھا خیال اپنا سناوے
کہیں قصہ کہیں ہووے کہانی
کہیں ہے مثنوی اور شعر خوانی
ہر اک کوٹھے بنا نقار خانہ
لگی آنے نوائے شادیانہ
وزیر الملک تو رہیو سلامت
بنی باعث سے تیرے یہ عمارت
بنایا لکھنؤ کو رشک گلزار
کیا آباد دریا وار تا پار
عجائب سیر کا عالی مکاں ہے
غرض یہ لکھنؤ رشک جناں ہے

کوئی شہروں میں ایسا کیا کہیں ہے — غرض یہ لکھنؤ رشک بریں ہے
جدھر دیکھو ادھر آئینہ رو ہے — عجب حیرت کی جا یہ لکھنؤ ہے
بنا ہی چوپارہ ہے کوٹھوں کے اوپر — چمکتی ہے بسان برق انور
نگہ کو تاب کیا جو اس پہ جاوے — جسے خورشید دیکھے تھرتھرادے
ہزاروں تھان زرّیں کے سراسر — وہاں لٹکائے بزازوں نے جاکر
کہیں تاش و درجھالا جھلا رہا ہے — چمک خورشید کی سی کر رہا ہے
کہیں تو بافتہ مشروع مشجر — کہیں تن صاف و شبنم اور دھوتر
کہیں تو بافتہ اطلس و پیلام — کہیں گوٹے کرنئی سے بھرا بام
کہیں ہے دھوپ چھاؤں اور چاندنی — کہیں دارا اور چولی رغوانی
کہیں رومی کہیں چینی کی چادر — کہیں زربفت چمکے ہے سراسر
نیمن اور ڈورپا یہ بافت آڑا — . . . .
نوالی ہے کہیں شالستہ خانی — کہیں لاہی برنگ زعفرانی
کہیں قندز کہیں قاقم معصف — دلق ہے اور نصب کیا خوب ..
کہیں سیفور و مشقالی منقش — کہیں مسوخ خوش تابان و دلکش
ہزاروں تھان چھینٹوں کے ترسر — کہ جس کو دیکھ کہہ اٹھے رشک گلزار
کہیں بسو کی چھانی رنگیاں ہیں — عجائب طرز کی پھلکاریاں ہیں
کہیں ساٹن کہیں ہے پر چونہ — کہیں مشرو تہ سے خطی رنگ شانہ
کہیں ململ کہیں تنزیب دیبا — کہیں نرگس منقش دلفریبا
بنارس کے دوپٹے اور گلاب — کہیں شیریں شکر ہے اور سنجاب
کہیں جھولی کرنئی اور دھرتے — خجل ہو چاندنی دیکھے سے جس کے
. . . . . اور پرنیاں ہے — کہ جس کے وصف میں قاصر زباں ہے
یہاں پر راہرو کرکے نظارہ — گریباں کر رہی ہیں پارہ پارہ
جو نظارہ کرے یک گلبدن پر — تو ہو غشوں کہا دی گل بدن پر
کہیں خرمی کہیں ہے چاندتارا — تمامی سے بھرا بازار سارا
جہاں پڑتی نظر رہتا وہاں دل — نگہ کو جاکے پھر آنا تھا مشکل

ہزاروں ماہرو لاکھوں گل اندام
لئے پھرتے تھے اپنی زلف کا دام

کوئی چیرا کلابی باندھ سر پر
کوئی آتا تھا سج اپنی بدل کر

کسی کے کان میں بالا پڑا تھا
کسی کے ہاتھ میں سیمیں کڑا تھا

کوئی ہیکل دکھا کرتا تھا بے کل
کہوں کیا ذکی میں آپس کی چھل بل

اشارے سے کوئی آنکھیں لڑاتا
کوئی شمشیر ابرو سے ڈراتا

کوئی کرتا ہے اوپر کو نظارا
کسی کا دل ہے نیچے پارہ پارہ

کوئی پردہ اُٹھا مکھڑا دکھاتا
کسی سے ہر کوئی چہرہ چھپاتا

صرف عشاق پر کوئی نظر کر
نگہ کا تیر مارے تھا جگر پر

مخاطب ہے کسی کا خیریت خواہ
کوئی کہتا ہے سن اَلحمدُ لِلّٰہ

کوئی بعد از فراقِ یار غمخوار
بوقتِ وصل یہ کرتا ہے تکرار

چہ خوش وقتی و خورم روزگارے
کہ یاری برخورد از وصل یارے

غرض میں کیا کہوں جو کچھ سما تھا،
نہ دیکھا یہ کہیں نہ یہ سنا تھا،

پری زادوں میں اک رشک پری تھا
سو بہرے بر میں پوشاکِ زری تھا

قیامت تھا نہ جانو یا کہ قامت
کہ جس قامت سے تھی برپا قیامت

بندھی دستار تھی نواب شاہی
تس اوپر طرۂ فضلِ الٰہی

قبا کمخواب کی سرخ و منقش
کہ جس کے دیکھتے دل ہو چلا غش

بنارس کا دوپٹہ زور دھج سے
لپیٹے تھا کمر میں کیا ہی سج سے

وہ خنجری دار شروع کا تھا شلوار
پڑا جالے کا بند جس میں طرحدار

... کیا آنکھوں میں اچھے
منقشی ریشمی خوش اسلوب لچھے

منقش کفش تھے پاتیں پری کے
ستارے جیسے روشن ہوں زری کے

اگر اہلِ نظر وہ کفش پاتے
برنگِ گل کے آنکھوں سے اٹھاتے

کہاں قسمت ہے جو وہ کفش پاویں
برنگِ گل کے آنکھوں سے اٹھاویں

مگر ہر دم یہی دل سے دعا ہے
بہار کہا و دشمن زیر پا ہے

کھڑا کوٹھے پہ تھا بہرِ نظارا
کسی کا ہو گیا ناگہہ گذارا

نگہ جب سے پڑی اس گلبدن پر
لگا کہانے وہ اپنے گل بدن پر

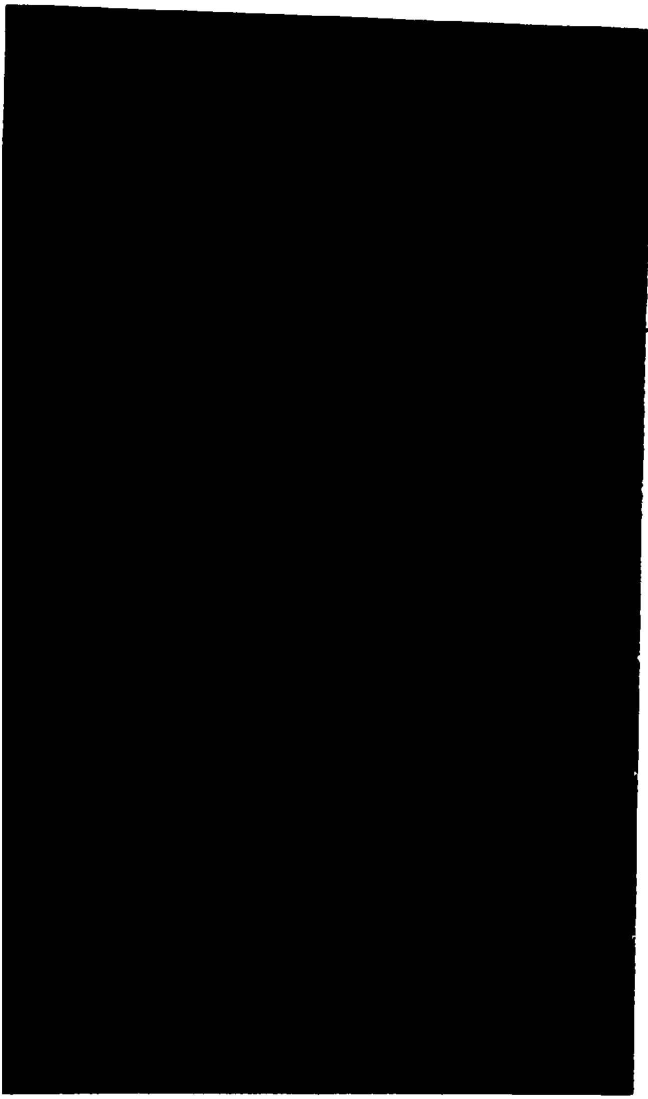
دیا جب مسکرا غنچہ دہن نے   کیا بے خود اسے دیوانہ پن نے
دکھا کر یار نے پنجہ حنائی   کیا عاشق کو اپنے کہربائی
جب حضرتِ عشق اسکے سر پہ آئے   تو چشموں سے کئی دریا بہائے
نگہ سے ناز سے چشم و ادا سے   خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے
غرض میں چھوڑ کر زخمی اُسے آہ   چلا اک آشنا کے ہو کے ہمراہ
کہ اتنے میں ہوئی آمد سواری   وزیر آصف بادِن ہزاری
کیمت خامہ کو کیا تاب و طاقت   کہے جو آصف خانی کی شوکت
لگی آنے جب اس کی فوج افواج   لگا لہرانے اُسدم بحرِ مواج
پرے فوجوں کے یوں آتے تھے ملکر   پہاڑوں پر گھٹا اٹھتی ہے جیونکر
ہزاروں فیل، کوتل، بلسے تا فرق   مرصع زر و جواہر میں سبھی غرق
ہزاروں پالکی نعلیں جگمگائے   کہ دیکھے برق جس کو رشک کھائے
ہزاروں بادپا باسازِ زرّیں   جھلا جھل چمکتی تھی مثلِ پروین
جہاں تک ساتھ اس کے اردلی تھے   سو پہرے بر میں پوشاکِ زری تھے
ہوا داخل وہ جب خورشیدِ انور،   پڑا اِک شور ہر بستی کے اندر
وزیر الملک تو رہیو سلامت   بنی باعث سے تیرے یہ عمارت
کمیتِ خامہ کو طاقت کہاں ہے   غلام از بس یہاں قاصر زباں ہے

نہ کچھ قصہ ہے اس میں نہ کہانی
مگر یہ مثنوی ہے سحرِ معنی

تمام شد مثنوی سحر معنی من تصنیف مشفقی میاں غلام امام صاحب سلمہ الواہب ابن شیخ ولی اللہ ساکن بسوہرائے خاطر فضل علی صورت ترتیم پذیرفت۔



مناظر



انجام

اسلم میرا دوست تھا ہم بچپن سے ہی دو سگے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے دُکھ سکھ کے شریک اور راز دار تھے۔ ہماری اخوت و محبت لوگوں میں ضرب المثل تھی اور پھر وہ دن جب اسلم نے مجھ سے کہا کہ وہ عنقریب شادی شدہ ہو جائیگا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی میں نے محسوس کیا کہ اسلم کسی بڑے جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہماری قلبی محبت کا حسرتناک انجام بہت قریب ہے۔ اب اسکی بیوی ہماری محبت کے درمیان ایک دیوار کی طرح حائل ہو جائے گی۔ میاں بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہے جہاں کسی غیر کی پرخلوص محبت کا بھی گذر نہیں۔ شوہر بنجانے کے بعد انسان اپنے عزیز ترین دوست کو بھی اس اعتماد سے یکسر محروم کر دیتا ہے جو کبھی دونوں کے لئے باعثِ فخر و ناز تھا۔

پھر اس کی شادی مجھے اس طرح یاد ہے گویا کل کی بات ہے گو میں مذہبی رسومات میں شامل نہ تھا مگر دعوت میری شرکت سے خالی نہ تھی۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اسلم کی بیوی کو نہ دیکھا تھا، وہ دراز قد تھی مگر زرد رو اس کی چال میں ایک لوچ تھا ایک روح انگیز لچک۔ اسلم اُس کا دیوانہ معلوم ہوتا تھا اور میں اسلم کی دیوانگی کو دیکھ کر لرزہ بر اندام۔ چند دنوں کے بعد میں اُن سے ملنے گیا۔ اسلم بہت گرمجوشی سے ملا اور بولا [illegible] جانتے ہو [illegible] کس قدر خوش ہوں، کس قدر مسرور [illegible]

محبت کرتا ہوں۔ مگر۔۔ وہ۔۔۔ ۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد ... اُس نے اپنی انگشت شہادت لبوں پر رکھ لی۔ اُس کے رُوئیں رُوئیں ... احترام ٹپک رہا تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہاں اسلم فقرہ نا تمام ... بولو۔ وہ بولا۔ کیا تم نہیں سمجھ سکتے؛ کیا میرا نا تمام فقرہ خود اپنی شرح ...

اسلم نے اپنی بیوی سے میرا تعارف بہت گرمجوشی سے کرایا ... مجھ سے تپاک سے ملی، مجھ سے اُس کا برتاؤ بہت مخلصانہ تھا، وہ ... کو اپنا ہی گھر تصور فرماتے اور کبھی کبھی چلے آیا کیجئے۔ ان فقروں ... غیریت تھی۔ میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ ... میرا تھا۔ آج مجھ سے کس قدر بیگانہ ہے، ہماری پرانی بے تکلفی ... تھی، اب بمشکل ہم تبادلۂ خیالات کے لئے کوئی موضوع تلاش ...

اس کے بعد اٹھارہ ماہ تک میں مختلف ممالک کی سیاحت کرتا رہا ...

جس دن میں اس طویل سفر سے واپس گھر پہنچا اُس کے ... علی الصبح بچپن کے رنگین باغوں کی فضا میں سانس لے ... رہا۔ میں اس تفریح سے فارغ ہو کر گھر کی طرف روانہ ہو ... زرد رو [illegible]

[illegible]

[illegible] سکتا ہی میری طرف بڑھا اور دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گیا۔

ہم دونوں سبزہ پوش قطعات میں محو خرام تھے اور پھر کشادہ سڑک پر آ پہنچے، میں نے محسوس کیا کہ اسلم مجھ سے جدا ہونے کے لئے بیتاب ہے معلوم ہوتا تھا وہ بہت تھک گیا ہے، میں نے اس سے پوچھا۔ اسلم تم بہت بیمار نظر آتے ہو، وہ بولا۔ ہاں میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں، اس کے اعضا سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی قوت بالکل سلب ہو چکی ہے اور وہ اب بالکل لب گور ہے۔ میرے دل میں اپنے مخلص ترین دوست کے لئے شدید جذبہ ہمدردی پیدا ہوا اس کے چہرے سے اس کی روح کا کرب صاف ظاہر تھا میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا کیوں اسلم کیا شکایت ہے، وہ بولا، کچھ بھی نہیں معمولی سی شکایت ہے

میں نے پوچھا تمہارے ڈاکٹر کی کیا رائے ہے وہ بولا، اس نے مرض کا کچھ نام ضرور بتایا تھا مگر مجھے یاد نہیں رہا مگر دوا کے طور پر اس نے جوہر فولاد تجویز کیا ہے، میرے دل میں ایک مہمل سا شک گذرا، میں نے اس سے پوچھا کہ تم خوش و خرم تو ہو؟ وہ بولا، ہاں بہت خوش، سوچو انسان کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا مسرت ہو سکتی ہے کہ اس کی بیوی خوبصورت ہے اور میں تو اس سے دیوانہ وار محبت بھی کرتا ہوں ایسی محبت جو اس سے پہلے مجھے کسی سے بھی نہ ہوئی اس کی ہر مسکراہٹ میرے لئے ایک حیات تازہ ہے

مگر اس جواب کے ساتھ ہی اس کے زرد چہرے پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی، اور میں نے محسوس کیا کہ وہ سوالات سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے میں اسے لپٹا ہوا ایک قریبی قہوہ خانے میں لے گیا جو اس وقت قریباً خالی تھا۔ اور پھر اسے زبردستی ایک کرسی پر بٹھا دیا میں نے اس کے بے نور چہرے پر نظر جمائی اور بولا، اسلم تمہیں مجھے سب کچھ بتانا ہوگا۔ بلا کم و کاست ورنہ یاد رکھو میں تمہارا پیچھا نہ چھوڑوں گا۔

اسلم بولا مگر کوئی بات بھی تو ہو۔۔۔۔ میں نے کہا مجھ سے چھپانے سے [illegible] تمہارا چہرہ رنگان شاہد ہے کہ تم بہت بیمار ہو یا کسی شدید روحانی عذاب میں مبتلا ہو جو تم کسی سے بھی بیان نہیں کر سکتے۔ کوئی بات تمہاری روح کو برباد کر رہی ہے تمہیں بتانا پڑیگا تم مجھ سے کہو گے یا پھر کبھی بھی میری گرفت سے نہ نکل سکوگے، بولو، دوبارہ اس کا چہرہ بالکل زرد ہو گیا اس نے کہا جمیل میں تباہ ہو چکا ہوں ۔ ۔۔ اور یہ کہتے کہتے اس کا دم پھول گیا اور وہ خاموش ہو گیا اور پھر دور بہت دور کسی چیز کو عالم خیال میں دیکھتے ہوئے بولا۔ تم اس قدر احمق کیوں ہو ... مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ جمیل مجھے چھوڑ دو

میں نے کہا، میں واقعات کا ایک ایک لفظ سننا چاہتا ہوں ایک ایک حرف تمہاری تباہ حالی کا مجھے اندازہ ہے مگر اس کے اسباب؟ — وہ بولا۔

سنو، دوست میری بیوی مجھے تباہ کر رہی ہے، موت کے منہ میں دھکیل رہی ہے، یہ ہے میری روئداد حیات، اس قدر مہمل جواب میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ میں نے پوچھا آخر کیسے، وہ بولا نہیں میں غلطی پر ہوں وہ نہیں [illegible] خود اپنی تباہی کا ذمہ دار ہوں۔ پھر ایسی آواز میں گویا کسی بہت بڑے جرم کا اعتراف کر رہا ہے بولا، مجھے اس سے محبت ہے۔ میں اس سے اتنی محبت کرتا ہوں جسے وہ سمجھنے سے بھی قاصر ہے۔ پہلے تو اس کے اس جواب نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، مگر دوسرے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میں اس احمقانہ گفتگو کا جواب ایک بلند قہقہہ سے دوں مگر اسلم کی دلآزاری کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے ضبط سے کام لیا اور یوں بولا اس مرض کا بہترین علاج تو یہی ہے کہ خود پر قابو پاؤ اور آہستہ آہستہ محبت کو اعتدال پر لے آؤ تاکہ یہ تمہارے لئے سوہان روح نہ ہو، باعث مصیبت نہ ہو"

میرے اس جواب پر وہ احمقوں کی طرح مجھے دیکھنے لگا گویا وہ میرے الفاظ کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر تھا مگر پھر اس انداز میں گویا مجھ سے [illegible] کچھ صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہے بولا ۔ میں اس کے اس جذبہ صاف [illegible] سے بہت مطمئن تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ آج پھر اسلم رہی ہے [illegible] وقت موالی کو دکھا تھا [illegible]

سامنے رکھ دینا چاہتا ہے،

وہ بولا جمیل یہ ناممکن ہے، میں اپنی محبت میں تخفیف نہیں کر سکتا کہ یہ محبت میرے لئے باعثِ حیات ہے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہی محبت مجھے ایک دن لبِ گور پہونچا دے گی، ایک دن آئے گا کہ میں اس محبت پر قربان ہو جاؤں گا۔ مگر پھر بھی میں اس میں کمی نہیں کر سکتا۔ میں اس موت سے خوش ہوں اور راضی برضا گو میں اس سے ڈرتا بھی ہوں، اکثر میں سوچا کرتا ہوں کہ میں اسے چھوڑ کر دور بہت دور دنیا کے دوسرے کنارے پر چلا جاؤں اور وہاں کسی نامعلوم مقام پر اپنی تمام زندگی گذار دوں اور دن بھر اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں گھر کی طرف رُخ بھی نہیں کرتا۔ مگر دن بھر ہرزہ گردی کرنے کے بعد شام کے وقت کوئی طاقت مجھے گھر کی طرف ڈھکیل کر لیجاتی ہے۔ بےچین ہو کر دیوانہ وار میں اس گھنٹی کو بجاتا ہوں جس کو چھونے کا دن بھر عہد کرتا رہا تھا وہ سامنے کرسی پر نیم وا نظر آتی ہے اور کہتی ہے بہت دیر کی، کہاں تھے، اور میں دن بھر کے عزائم اور منصوبوں کو بھول جاتا ہوں، پھر ہم کھانے کی میز پر بیٹھ جاتے ہیں اور کھانے کے دوران میں پھر سوچتا ہوں کہ کھانا کھاتے ہی میں فوراً اس گھر سے چلا جاؤں گا اور رات کی تاریکی میں یہاں سے کوسوں دور نکل جاؤں گا کسی ایسی جگہ جہاں انسان نہ ہو اس دنیا کے روح فرسا مصائب نہ ہوں جہاں کوئی بھی مجھے نہ دیکھ سکے جہاں لاکھ تلاش کرنے پر لوگ مجھے نہ پا سکیں مگر کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب ہم دوبارہ کمرۂ نشست میں آتے ہیں تو ان گدے دار کرسیوں کو دیکھ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ میری روح تھک گئی ہے، اور اب مجھ میں ایک قدم اُٹھانے کی بھی طاقت باقی نہیں میں بے حس و حرکت ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں اور اس کے چہرے کو لغور دیکھتا ہوں اور پھر اس حسین نظارے میں محو ہو کر اپنے تمام ربح فرسا مصائب۔ یہاں تک کہ موت سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہوں۔

پھر اس کی ہر مسکراہٹ کے ساتھ میرے لبوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے اور لاکھ ضبط پر بھی میں اپنی اس کو اس مسرت سے محروم نہیں رکھ سکتا جمیل منو میری اس عجیب منطق پر خوب ہی کھول کر ہنسو مگر خدا کی قسم یہ حالات بہت خطرناک ہے ...... میں نے کہا مگر اسلم تم یہ سب کچھ اپنی بیوی کے سامنے کیوں نہیں کہہ دیتے وہ یقیناً انسان ہے، اور حساس بھی وہ ضرور اسے سمجھے گی اور...... اُس نے اپنے کندھوں کو جنبش دی اور بولا۔ جمیل تم جو چاہو کہو اور پھر اپنے الفاظ پر خود ہی یقین بھی کرلو کہ یہ حق بجانب ہیں مگر میں اس عورت کو تم سے بہت زیادہ سمجھتا ہوں میں اُس کی ہر نگاہ سے بخوبی واقف ہوں میں اُس کی ذہنیت کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور اسی لئے میں کبھی اُس کے سامنے اپنا دل کھول کر نہیں رکھ سکتا۔ مگر جمیل نہ قصور اُس کا ہے نہ میرا.... اُس کے مزاج کی افتاد ہی یہ ہے کہ وہ میرے ہر فعل کو میری دیوانہ وار محبت کو اپنا جائز حق اور میرے جائز فعل سے زیادہ اہمیت نہ دے اور میری گرمجوشیوں پر مسرور نہیں متوحد ہو کر مجھ سے اس سے بھی زیادہ کی طالب ہو اور جب وہ سب کچھ مل جائے جو وہ چاہتی ہے تو جواب میں ایک بار مسکرا کر یا احساس برتری کا اظہار کر کے خاموش ہو جائے۔ اُس کا ایمان ہے کہ عورت صرف محبت کئے جانے کے لئے پیدا ہوئی ہے اور مرد صرف محبت کرنے کے لئے، وہ کہا کرتی ہے کہ مرد کا فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی کی تمام راحتیں اپنی حیات کی تمام مسرتیں عورت کے قدموں میں رکھ دے اور جواب میں ایک دھندلی سی مسکراہٹ کا بھی طالب نہ ہو۔ کہ عورت کو خدا نے فضیلت دی ہے اور مرد کو اُس کی خدمت گذاری کا فرض، اُس کے خیال میں عورت ایک ملکہ ہے اور مرد اُس کا ایک ادنیٰ غلام۔

ہر روز میں اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اور وہ زیادہ سے زیادہ اُلجھتی چلی جاتی ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور وہ جواب میں محبت کی بجائے حق طلبی پھر بھی اُس کی ایک نگاہِ کرم کی آرزو میں جو شاید مدتوں میں ایک بار مشکل سے پیدا ہوتی ہے میں زندگی کو بخوشی برداشت کرتا ہوں [illegible]

[illegible] میں اکثر اس کے کہیں ہاتھوں کو جن میں جذبات [illegible] کو کبھی نہیں ہوتی اپنے ہاتھوں میں لے کر عہد کرتا ہوں کہ بس یہ [illegible] اس عہد کے بعد یہ ہاتھ کبھی میرے ہاتھ میں نہ آئیں گے، میں اس وادی موت کی طرف ایک قدم بھی نہ بڑھاؤں گا اور یہ عہد کرکے میں گھر سے نکل جاتا ہوں اور دن بھر اِدھر اُدھر سر پھوڑنے کے بعد جب واپس آتا ہوں تو یہ عہد ے خوار کی زد پہ نظر آتا ہے جو بادل کے ایک ٹکڑے یا ہوا کے ایک خنک جھونکے سے ٹوٹ جاتی ہے میرے دل میں آرزوئے شکست ہوتی ہے اور نگاہوں میں محو تبدیہ

میری روح کی مردنی نہ پوچھو۔ کل میں اتفاقاً قبرستان کی طرف جا نکلا اور گھنٹوں وہاں بیٹھا سوچتا رہا کہ میں کیونکر ان لوگوں میں شریک ہو سکتا ہوں جو یہاں علائق دنیوی سے بے نیاز پڑے ہوئے ہیں پھر خیال آیا کہ زہر کو اس وادی کا راہبر بنایا اور میں نے ایک شیشی زہر لا بھی کی خریدی مگر گھر پہنچتے ہی تمام عزائم ملیا میٹ ہو گئے

جمیل تم ان جذبات کو نہیں سمجھ سکتے، ایک سگرٹ پینے والے سے پوچھو جو خود کو آہستہ آہستہ سگرٹ نوشی سے موت کی طرف لیجا رہا ہے کیا وہ اسے جاننے پر بھی اس عادت کو ترک کر سکتا ہے کیا وہ اس لطف سے دست بردار ہو سکتا ہے اور تمہیں بتا سکتا کہ سینکڑوں بار اس نے اس عادت بد کو ترک کرنے کا عہد کیا ہے مگر لاحاصل وہ موت کو سگرٹ سے دست بردار ہونے پر ترجیح دے گا۔ بس میری بھی یہی حالت ہے جب انسان کسی جذبے کا شکار ہوتا ہے تو وہ اُسے انتہا تک پہونچا کر ہی دم لیتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے اجازت چاہی آہ میرے دل میں اس عورت کے خلاف کس قدر غصہ اور نفرت بھری ہوئی تھی کوئی بھی خانہ نہیں کر سکتا میں نے اُس سے کہا۔ اسلم اس خوبصورت ناانصاف [illegible] کرو اور اگر وہ راہ راست پر نہ آسکے یا بے پروائی ہی برتتی چلی جائے تو اُس سے دست بردار ہو جاؤ۔ اُس نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور چلا گیا۔

مگر چھ ماہ تک مجھے اسلم کی کچھ خبر نہ ملی ہر صبح میں اُس کی موت کی خبر کا انتظار کرتا۔ مجھ میں اُس کی خیریت طلبی کیلئے اس کے مکان تک جانے کی بھی جرات نہ تھی، اُس کی مُردنی چھائی ہوئی صورت ہر وقت میرے سامنے تھی اور میں سے دوبارہ دیکھ کر اپنی روح کو اذیت نہ دینا چاہتا تھا

موسم بہار کی ایک خوشگوار صبح جب میں مصروف گلگشت تھا دل میں امنگوں کا جوش تھا اور سبزے کو چھیڑنے میں ایک خاص لطف آرہا تھا کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، یہ اسلم تھا جو ہمیشہ سے بہت زیادہ تندرست نظر آرہا تھا اُس کے چہرے پر شباب کا خون موجیں لے رہا تھا اُس نے مجھے دیکھتے ہی ہنستے ہوئے گلے لگا لیا اور بولا۔ جمیل کہاں ہو ملتے تک نہیں۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا اور بولا، گذشتہ چھ ماہ میں تم کس قدر بدل گئے ہو اور اس خوشگوار تبدیلی پر میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ وہ بولا، جمیل انسان ہر حالت میں خوش رہنے کے لئے مجبور ہے۔ میں نے اُس کے اس فلسفیانہ جملے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا اب تم بالکل اچھے ہو کیسی خوشی کی بات ہے اس کے چہرے پر کرب کی ایک خفیف سی جھلک نمودار ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے اُس نے اپنی حالت سنبھال لی اور بولا جمیل آخر تم مجھے مل گئے۔ بہو اب روز ملا کروگے میں اب وہی اسلم ہوں تمہارا بے لوث اور محبت کرنے والا دوست میں کچھ نہ سمجھ سکا اور پوچھا مگر اسلم چھ ماہ پہلے تم نے جو اپنی روداد سنائی تھی کچھ یاد ہے۔

وہ اس سوال پر زرد ہوگیا اور بولا، جمیل خدا کے لئے جو کچھ میں بھول چکا ہوں یا بھول جانے کی کوشش کر رہا ہوں مجھے از سر نو نہ دلاؤ۔ تم بھی سب کچھ بھول جاؤ۔ آج کھانا میرے ساتھ کھانا، مزہ اور وہ چلا گیا، وہ کانپ رہا تھا۔ اس خیال سے کہ میں معاملات کو

راح سمجھ سکوں بیٹھی اس کے گھر جانے کا تہیہ کر لیا۔

اس کی بیوی نے بہت تپاک سے میرا استقبال کیا، آج وہ کس قدر جاذب نظر معلوم ہوتی تھی۔ ہم ابھی رسمی گفتگو سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص کمرۂ نشست میں داخل ہوا، رشید کے نام سے اس کا مجھ سے تعارف کرایا گیا اور ہم سب کھانے کے کمرے میں چلے گئے، رشید گٹھیلے جسم کا پہلوان نما انسان تھا اور اس کی نظر اسلم کی بیوی کے چہرے پر جمی ہوئی تھی، کھانا بہت پر تکلف تھا اسلم زیادہ تر مجھ سے ہی مخاطب تھا وہی تخاطب جو کبھی ہم دونوں کے لئے باعث مسرت ہوا کرتا تھا۔ میں کبھی کبھی رشید اور اسلم کی بیوی کو دیکھ لیتا تھا جو ایک دوسرے کو جذبات کی شعلہ ریز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

کھانا ختم ہوتے ہی اسلم اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولا، دیکھو جمیل آج بہت دنوں میں ملا ہے لہذا میں اس کے ساتھ تفریح کے لئے جا رہا ہوں اور رشید تو تمہارا دل بہلانے کے لئے موجود ہی ہے، اسلم کی بیوی مسکرائی مگر آہ اس مسکراہٹ میں کس قدر شرمندگی تھی جس کا قطرہ اسکی مرمریں جبیں پر جھلک رہا تھا۔

ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے ٹہلتے ہوئے چلے گئے میں ساتھ ساتھ کوشش کر رہا تھا اور اسلم سے پوچھنے کے لئے لفظوں کی تلاش آخر میں ہی بولا۔ اسلم خدا کے لئے کچھ تو سمجھاؤ یہ کیا معاملہ ہے اسلم اس طرح گویا کسی نے زور سے اس کے سینے میں گھونسا رسید کیا ہو پیچھے ہٹ گیا اور بولا جمیل حق نہ بنو ہر وقت سوالات آنکھوں سے کام لو اور زبان کو جنبش نہ دو یہی بہتر ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دو۔

ہم خاموش چلے جا رہے تھے کہ اسلم بولا کیوں دوست کسی حسین دوشیزہ کی معیت میں دو چار جام کیا ارادہ ہے۔ میں سب کچھ سمجھ گیا اور ہنس کر بولا ؎

درکار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست

سروپ رانی نگار (ماہ پاسان)

بے ثباتی عالم

ایک ٹہنی میں ایک اکیلا پھول
صبح کی یہ فضا میں جھولتا ہے
گردن ہلتی ہے بے ثباتی پر
اسکا مطلب ہے یہ کہ اہل نظر
کوئی دم میں بکھرتے ہیں ورق
وقت تھوڑا ہے دکھ بہت ہے مجھے
ایک دم کی ہے زندگی ساری
راس کس کو ہے یہ بہار چمن

کتنا خاموش ہے الگ چپکا
جنبش دے رہی ہے سرد ہوا
مسکراتا ہے پھول سا چہرہ
زندگی نام ہے نفس بھر کا
کوئی ظالم جو توڑ پھینکے گا
اس چمن میں سدا نہیں رہنا
ہوں اسی سوچ میں گھلا جاتا
کس نے ٹھیکہ لیا ہمیشہ کا!

خود ہے شاعر میں انقلاب کا رنگ
ہر نفس میں بدلتی ہے دنیا

آغا شا[illegible]

انتظار کی ایک رات

فیض صاحب کی یہ کوشش آرٹ کے نقطۂ نظر سے بہت بلند ہے اُردو میں اس قسم کی تحریروں کا فقدان ہے افسانوی رنگ کے ساتھ ساتھ نفسیات کی (Sidelights) نے اس ادب پارے کو بہت دلکش یا طالسطائی کی زبان میں بہت (Infection) (متعدی) بنا دیا ہے مضمون سے متاع کا پورا اخلاص اور اظہار کی وضاحت بھی حُسن تشکیل، اس تعدیہ کے پیدا کرنے والے ہیں ——— **سعادت**

(۱)

"یہ تاش بھی کیا بیہودہ کھیل ہے۔ دبیز کاغذ کے ٹکڑے اور اُن پر چند بے معنی نقوش یا نظر سوز تصویریں پھر انھیں ایک ایک کرکے میز پر پھینکتے رہنا۔ آخر بات کیا ہوئی، لیکن لوگ ہیں کہ گھنٹوں سر نہیں اُٹھاتے گویا زندگی کے اہم ترین کام میں مصروف ہیں میں سمجھتا ہوں کہ۔"

"حمید کس سوچ میں ہو؟ پتہ پھینکو"

"بھئی میں تو اُکتا گیا ہوں۔ اس کھیل میں مجھے تو خاک بھی دلچسپی نہیں۔"

"جی۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ۔ جن کے لئے تاش سے بہتر دلچسپیاں موجود ہیں۔"

"بکو نہیں۔"

(آہستگی سے) "اچھا کہو۔ آج رات وعدہ۔"

"خدا کے لئے چپ بھی رہو۔ بھائی جان سُن لیں گے:"

"تو کیا ہوگا (گنگناتے ہوئے) نیند اس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں"

(بلند آواز سے) "اچھا میں جاتا ہوں۔ میری جگہ کسی اور کو بٹھا لیجئے مجھے صبح اسٹیشن جانا ہے کچھ دیر سو رہوں۔"

"نیند اس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں ... ..."

گنگناتی ہوئی آواز حمید کا سیڑھیوں میں تعاقب کرتی ہوئی اُوپر کمرے تک پہنچتی ہے

(۲)

"نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے۔ راتیں اُس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں۔"

"زلفیں جن کی پُراسرار خوبصورتی کو آج میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا دوپہر کے وقت جب وہ اُنکی پُرشوکت پریشانی کو سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی:" ـــ

تُو اور آرائشِ خمِ گیسو
میں اور اندیشہ ہائے دُور و دراز

اُف یہ شعر اُس وقت کیوں نہیں یاد آیا مُشتے بعد از جنگ۔ خیر پھر کبھی کام آئے گا .... معلوم نہیں شاعر بالوں کو رات سے کیوں تشبیہ دیتے ہیں۔ آخر بالکل تاریک رات میں کیا حسن ہوتا ہے ۔ ہاں اگر ایسی رات میں ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر پیش کیا جا سکے تو شاید اُس کے بالوں کا ہلکا سا تصور ذہن میں آ جائے! جانے دو۔ اور وہی آرزو معلوم ہوتی ہے گیارہ بج چکے۔ انتظار کے دو گھنٹے باقی ہیں۔ اتنا عرصہ کیا کیا جائے! دیکھوں۔ پانچ سگریٹ باقی ہیں ایک بجے تک وقت کٹ جائے گا اور اس کے بعد "نیند اسکی ہے۔ دماغ اُس کا ہے" ..... نیند تو خیر نہیں لیکن کم از کم باقی سب کچھ ...... دیکھ آؤں سیڑھیوں کا دروازہ کھلا ہے یا نہیں۔ -- نہیں - بارہ بجے سے پہلے نہیں۔ ابھی لوگ جاگتے ہوں گے شاید کسی کو شک گزرے اتنے عرصہ پوشیدہ رہنے کے بعد اگر آج راز کھل گیا تو - ہر شخص کو پہلے ہی سے شبہ ہے ۔ روشنی گل کر دی جائے ہاں اس سے آپ کی جذبہ پرستی میں خلل آتا ہوگا، نہیں یہ بات تو نہیں لیکن روشنی میں کمرے کی بکھری ہوئی چیزوں پر نظر پڑتی ہے اور میں اپنا دماغ ایسی فضول حسیات سے پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ دو گھنٹے صرف اُس کا حسین تصور میرے سامنے رہے۔ ... جذبہ پرستی؛ خیر جذبہ پرستی سہی لیکن یہ جذبہ پرستی مصنوعی نہیں ...... اُسنے کیا کہا تھا میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوگا یا بند؟ غالباً کھلا کہا تھا۔ ایک پٹ کھول دیا جائے۔ سامنے آسمان کی وسیع نیلاہٹ میں ایک ستارہ ڈوبتا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ باقی عرصہ اسی پہ نظر جمائے رکھوں۔ شاید وہ اس کی روشنی سے نکل کر پرواز کرتی ہوئی جھمک آ پہنچے۔ کہیں اسی قسم کی بات پڑھی تھی۔ معلوم نہیں کہاں ......

میں سے۔ غالباً ننگے پاؤں۔ آہستہ آہستہ اُڑتی ہوئی اپنے [illegible] حُسن کی بے پناہ رعنائیوں سمیت۔ آہ وہ کس قدر حسین ہے جسم اور چہرے کی رعنائیاں ہم آہنگ خطوط میں ایک خواب آلود حزنیت لئے ہوئے۔ چغتائی کی تصویروں کا سا حُسن .... آج جب میں نے عرصہ کے بعد اُسے پھر دیکھا تو شدّتِ احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اچھوتا تجربہ تھا۔ اگر کسی نظم یا افسانے میں بندھ جائے تو داد ملے۔ ... بھلا وہ اس وقت کیا کر رہی ہوگی؟ شاید سو گئی ہو۔ نہیں اُس نے آنے کا پختہ وعدہ کیا تھا۔ شاید بچپن کے وہ دن یاد کر رہی ہو جب اُسے واقعی مجھ سے محبت تھی اور اب -- کون کہہ سکتا ہے میں بہت کچھ سُن چکا ہوں۔ شاید اُس کے محبت بھرے خطوط محض انشا پردازی کی مشق ہوں نہیں۔ نہیں اُن کے الفاظ سے صداقت کی بُو آتی ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ یہی الفاظ کسی اور کی جانب بھی لکھے جاتے ہوں۔ ... ذلیل توہمات! اُس کی پاکیزہ ہستی کے متعلق یہ خیال کرنا بھی کفر ہے۔ اور اگر ایسا ہو بھی تو کیا میں نے ایسی حرکات نہیں کیں۔ لیکن اس کے باوجود میری محبت ..... اگر سوچا جائے تو مجھے اُس سے محبت کرنے کا حق ہی کیا ہے۔ میرا دل میرا جسم میرا دماغ سب وقتاً فوقتاً اوروں کی ملکیت رہ چکے ہیں ...... لیکن اس کی وجہ بھی تو اُس سے میری محرومیت ہی تھی۔ ہاں ایسے اور بھی کئی حیلے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ نہیں اب تک میری زندگی کے مقدس ترین لمحے اُس کی صحبت یا اُس کی یاد میں گزرے ہیں۔ جب کبھی اُس کا تصوّر کرتا ہوں یا اُسے خواب میں دیکھتا ہوں تو گناہوں کی کشمکش سے نکلے ہوئے حواس پر ایک کیف آور سکوت چھا جاتا ہے ....

آہ بچپن کے وہ معصوم دن جب زندگی ایک زرخیز [illegible] میں پہلی پرواز کے لئے پر تول رہا تھا [illegible]

[illegible] ازہ پہلا ہی سے کھلا ہے۔ فطرت ہماری طرف لڑی [illegible] ہو لیکن یہ تو سوچنا چاہیئے کہ وہ آئے گی ذکر لگا کیا؟ [illegible] وہ کہاں آئے گی تاہم کچھ غور سے سوچ رکھنے چاہئیں۔ ایسے موقعوں پہ کچھ سوچا ہی نہیں کرتا۔ ثریا پیاری۔ میں نے تمام عمر صرف تم سے محبت کی ہے اور اپنی جوانی کے بہترین لمحات صرف تمہاری ہی یاد میں صرف کئے ہیں۔ نہیں میری محبوبہ انکار ہو اور میں نے اپنے دل کے پاکیزہ ترین نغمات تمہارے ہی قدموں پر نچھاور کئے ہیں۔ تم نہیں سمجھ سکو گی ... لیکن مجھے اس سے محبت ہے بھی یا یونہی اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دماغ ساکت اور دل میں ایک خلا سا معلوم ہوتا ہے۔ وہ ہیجان وہ اضطراب جو اس وقت محسوس ہونا چاہیئے محسوس نہیں ہوتا۔ اگر میں اپنی ذہنی کیفیت کسی افسانوی کردار سے منسوب کر کے ایک افسانہ لکھ دوں تو خاصا خوب ہے۔ وہ اپنے جذبات کو برانگیختہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن فہم و ادراک کی سرد ہوا انہیں دبائے ہوئے تھی۔ وہ برف کے تودوں پر آگ جلانے کی کوشش کر رہا تھا" لاحول ولا قوۃ کیا درد سر مول لے لیا۔ یہ افسانہ نویسی ہمارے بس کا روگ نہیں۔ اسے اوروں پر ہی چھوڑ دیجئے ... ساڑھے بارہ ہوگئے۔ سردی محسوس ہو رہی ہے۔ اوور کوٹ پہن لیا جائے۔ نہیں نہیں پہننا چاہیے۔ شاید مجھے نزلہ ہو جائے۔ پھر تو یہاں دس پندرہ دن اور ٹھہرنے کا معقول بہانہ ہاتھ آ جائے گا۔ اس کی پریشانی سے اس کی محبت کا ثبوت بھی مل جائیگا خدا کرے مجھے نزلہ ہو جائے ... لیکن دریا کا تو اب موسم ہی نہیں رہا ہوا میں پہلی سی خنکی باقی نہیں۔ اوور کوٹ پہن ہی لیا جائے۔ بیفائدہ [illegible] سے فائدہ؟ وہ آئیگی تو سہی! شاید نہ آئے۔ نہ آئے [illegible] شاید ٹھیک سے مل کر ایک دوسرے کے متعلق ہمارے خیالات [illegible]۔ علاوہ ازیں صبح اس انتظار اور ذہنی درد و کرب کا نقشہ ایسے رقت انگیز الفاظ میں کھینچ کر بھیجوں گا کہ تڑپ اٹھیگی ؎

کجا بودی کہ امشب سوختی آزردہ جانے را

بقدرِ روزِ محشر طول دادی ہر زمانے را

پھر وہ منت سماجت سے مجھے منانے کی کوشش کریگی لیکن میں بڑی خدا بے نیازی سے لکھ بھیجوں گا: مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ گلہ شکایت تو تب ہوتی جب انسان کا کسی پر حق ہو لیکن میرا آپ پر کیا حق ہے؟ ؎

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ

کیا کسی کا گلہ کرے کوئی

واللہ کیا شعر ہے! لیکن ڈاکٹر لطیف صاحب غالبؔ کو شاعر نہیں مانتے۔ غالبؔ اردو کا پہلا شاعر ہے۔ جس نے انسانی جذبات کا جھلک اور وہ بہ رو مشاہدہ کیا۔ اس سے پہلے کے تمام شعرا کے نزدیک اہم جزو جذبات نہیں بلکہ جذبات کے وہ رسمی ملبوسات تھے جنہیں [illegible] وضع کر گئے ہیں۔ جذبات کی عریانی کا حسن صرف غالبؔ نے محسوس [illegible] جذبات فی نفسہٖ ادبی قیمت رکھتے ہیں اور انہیں روایتی رنگ [illegible] کے بغیر پیش کرنا ہی صحیح شاعری ہے۔ اگر غالبؔ پیدا نہ ہوتا تو اس [illegible] کون فروغ دیتا۔ لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر لطیف صاحب غالبؔ [illegible] روایتی شاعر منوانے پر مصر ہیں۔ یہ بیچ میں کیا بکواس شروع ہو گ[illegible]

"مجھ کو زمانے سے غرض"۔ ... . . .

بج ہی گیا ایک۔ آتی ہی ہوگی۔ آخری سگریٹ سلگا لیا جائے۔ جو [illegible] پیدا کرتا ہے۔ مقابلہ کے امتحانوں میں اگر وہ کمبخت سگریٹ پینے کو [illegible] دیدیں تو ... قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ آ گئی؟ [illegible] ابھی نہیں۔ سامنے دروازے سے ٹیک لگا کے کھڑا ہو جاؤں۔ تمام عرصہ یونہی کھڑا رہا ہوں۔ بہت متاثر ہوگی۔

دس منٹ اور ہو گئے معلوم نہیں کب آئے گی۔ بیٹھ ہی جاؤں۔ کیا میری محبت اُسے کبھی متاثر نہ کر سکے گی؟ اسے ذرا بھی احساس نہیں کہ میں اس کے انتظار میں کیا عذاب جھیل رہا ہوں مگر کوئی عذاب تو نہیں۔ آرام کرسی پر بیٹھ کے سگریٹ پی رہا ہوں۔ اس میں عذاب کی کیا بات ہے۔ شاعر لوگ جس انتظار کا رونا روتے ہیں وہ کسی اور قسم کا ہوتا ہوگا۔ پھر آہٹ ہوئی۔ اب تو یقیناً وہی ہے۔ نہیں۔ نہیں آئیگی۔ کوئی نہیں آئے گا غریبوں کی کون پرواہ کرتا ہے ہائے ۔۔ ڈیڑھ بج چکا سگریٹ بھی ختم ہو گئے ہیں۔ ستارہ دھندلا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ فضا میں سیاہ دھبے کیسے ہیں؟ اگر ایک سگریٹ اور ہوتا ...

ہیں! کیا میں سو گیا تھا۔ نہیں مجھے سونا نہیں چاہئے۔ آج رات میں کیسے سو سکتا ہوں۔ یہ میری زندگی کی پہلی رات ہے اور غالباً یہ رات پھر کبھی نہیں آئے گی۔ مقدر میں جو مقسوم تھی وہ آج ہی کی شب تھی کاش وہ آجائے! یا اللہ ایک دعا تو ہماری بھی سن لے۔ مانا کہ میرے بہت گناہ ہیں اور مجھے دعا کرنے کا بھی حق نہیں لیکن تجھے اتنا بڑا خدا ہو کے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں جانا چاہئے۔ یا اللہ وہ آجائے۔ ۔۔ جانے بھی دو فضول باتیں ..... آج ہماری کونسی دعا قبول ہوئی ہے جو اب ہوگی۔ ستارہ دیوار کی اوٹ میں اوجھل ہو چکا۔ نیند سے آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ لیکن مجھے سونا نہیں چاہئے۔ شاید آجائے ..... سو بھی جاؤں تو کیا مضائقہ ہے۔ اگر وہ آئی تو دروازہ کی آہٹ سے چونک اٹھوں گا ... صبح جاگتا ہے۔ امتحان میں صرف دس دن۔ تم بہت سنگدل ہو ثریا۔

(۳)

"حمید! ابھی تک سو رہے ہو؟ اسٹیشن پر نہیں جاؤ گے؟" یہ اس کی ہمشیرہ کی آواز تھی۔ کرسی پر ہی سو رہے۔ چارپائی پر کیوں نہیں لیٹے۔ کپڑے بھی تو نہیں اُتارے کتنے سست ہو۔ اور یہ سامنے کا دروازہ کیوں کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ اگر خدانخواستہ سردی لگ جاتی تو ..."

"ہیں، کیا دروازہ؟ اچھا تو وہ نہیں آئی!"

فیض ایم۔اے

اختیاراتِ محبت

آئیے دلبیں، چراغِ دل فروزاں کیجے
روح بے تزویر کو صبحِ گلستاں کیجے

چاندنی راتوں میں اُن سے عہد و پیماں کیجے
شمعِ اُلفت کو بجھانا کیا، درخشاں کیجے

داغِ سوزِ دل کو فرقت میں نمایاں کیجے
اس طرح پیدا جوابِ ماہِ تاباں کیجے

اضطرابِ قلب بڑھتا جا رہا ہے دمبدم
وعدۂ دیدار کو جزوِ رگِ جاں کیجے

اختیاراتِ محبت دیکھنے کی چیز ہیں
حکم ہے اُن کا بھرے گھر کو بیاباں کیجے

آئیے دیکھیں تماشائے بہار بے خزاں
اک ذرا تحقیق تاکرۂ رفع ہیجاں کیجے

تاکجے یہ شکوۂ اربابِ دنیا اے نذیر
اپنے درد دل کا خود ہی کیوں نہ درماں کیجے

نذیر شبکو

گیت

اسے زبانِ اُردو کی خوش قسمتی سمجھو یا بد قسمتی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ آجکل جبکہ اُردو کی بقا اور حیات کا مسئلہ ایک پیچیدہ مگر ایک دلچسپ صورت اختیار کئے ہوئے ہے (کیونکہ آجکل اُردو۔ ہندی اور ہندوستانی کا پیچیدہ مسئلہ چند اشخاص کی غیر ذمہ دارانہ کوششوں کی وجہ سے ایک قومی اور مذہبی مسئلہ بن گیا ہے) اُردو میں ایک نئی صنفِ شاعری ایجاد ہو کر قبولیت عام کا درجہ حاصل کیا چاہتی ہے۔ میرا مطلب گیتوں سے ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ لفظ میرا کہاں تک صحیح ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ تقلید ہندی ادب کے اُردو ادب پر بڑھتے ہوئے اثر کا نتیجہ ہے جس کو ٹیگور کے نغموں نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ میرا نظریہ ہے کہ اگر ٹیگور کے نغمات اس قدر مقبول نہ ہوتے تو شاید آئندہ کئی نسلوں تک اُردو کو اس صنفِ شاعری کی تجدید کے لئے انتظار کرنا پڑتا۔ مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں کہ گیت اُردو شاعری کی نشوونما کے لئے کہاں تک ضروری ہیں اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ اس جگہ میں صرف اس قدر بتانا چاہتا ہوں کہ اردو میں اس صنف کی ابتدا کیسے ہوئی ٹیگور کے نغمات کا تو میں ذکر کر چکا ہوں۔ اب مجھے انگریزی شاعری کی اس صنف کا ذکر کرنا ہے جسے اصطلاح عام میں ([illegible]) یا نظم غیر مقفیٰ کہتے ہیں شاید یہ بات بہت سے لوگوں کو عجیب معلوم ہو لیکن انگریزی ادب کی قبولیت اور اس کے اردو ادب پر بڑھتے ہوئے اثر نے ہندوستانی ادبا کو انگریزی کے مختلف اصنافِ سخن سے روشناس کرا دیا۔ اور اسی وجہ سے بلینک ورس ([illegible]) اور پھر اس کے بعد ورس لیبر باوجود نئی ہونے کے مقبول ہونا چاہتی ہے لیکن چونکہ زبانِ اُردو ابھی نظم غیر مقفیٰ نے رواج نہیں پایا ہے۔ اس لئے اُردو میں تو زبان سے اتنی آزادیاں نہ لی گئیں۔ البتہ اتنا ہوا کہ ایسے مضامین جو ورس لیبر کے لئے مخصوص تھے ہم نے گیتوں میں ادا کرنا شروع کر دئیے۔ لیکن ان تمام وجوہ سے بڑھ کر گیتوں کے رواج کی ذمہ دار جو چیز ہوئی وہ یہ تھی کہ اُردو شعراء نے اس کو محسوس کیا کہ جس چیز کو پنجاب ترنم کے نام سے تعبیر کرتا ہے وہ اصل شاعری کی جان ہے۔ اور جو شعر نظم یا غزل اس سے مبرا ہوگی وہ لٹریچر میں ممتاز حیثیت سے شامل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اغلب ہے کہ ایسی شاعری تو خرافات بن کر رہ جائے یا پند و نصائح کے لباس میں عوام کے لئے ہوا بن جائے۔ ہندی ادب میں یہ ترنم چونکہ بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس کا زیادہ تر استعمال گیتوں میں ہوتا ہے اس لئے اُردو میں بھی ہندی کا تتبع کیا جانے لگا۔ غزل اگرچہ اس کمی کو کسی حد تک پورا کرتی ہے۔ لیکن غزل کا نفسِ مضمون اس کی بحر اور قوافی اور ردیف کی کڑی قیود غزل کو ایک پرانی اور فرسودہ چیز بنا چکی تھیں اور جدت پسند [illegible] صنوبری کی تقلید میں اپنی قومی شاعری میں تھوڑی چاشنی کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

گیت زبان اور ادب اُردو میں اگرچہ ایک نئی اور ضروری چیز کا اضافہ کرتے ہیں۔ لیکن ترنم کا ناجائز استعمال اور ہندی گیتوں کی اندھا دھند تقلید سے اندیشہ ہے کہ اُردو کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود گیتوں کا مذاق بڑھنے کے میں گیت لکھنے کی بجائے سخت مخالف ہوں۔ ہمارے نوجوان شعرا گیت لکھنے میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں اور ہندی کا الم انہیں اس قدر محو کر دیتا ہے کہ وہ اس بات کی پرواہ بھی نہیں کرتے کہ کیا وہ چیز جو انکا قلم اس تیزی اور جوش سے لکھتا چلا جا رہا ہے اردو بھی ہے؟ عام گیتوں کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں سوائے ایک آدھ اُردو لفظ کے اکثریت ہندی الفاظ کی ہے وہی گیت جو اردو اخبارات اور رسائل میں شایع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کرتے ہیں اگر بجنسہٖ بغیر کسی تبدیلی کے بعد ہندی رسم الخط میں نقل کر لئے جائیں تو ہندی رسائل کو ان کے شایع کرنے میں بالکل تامّل نہ ہوگا۔ میں غیر زبان کے چیدہ الفاظ کا اُردو میں رائج ہو جانا معیوب نہیں سمجھتا بلکہ میرا خیال ہے کہ اگر ہم تراجم کے ذریعے غیر ممالک کے شاہکار اردو داں طبقہ کے افادہ کے لئے اُردو رسائل میں شایع کرائیں تو اُردو کی بقا اور ارتقا کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اُردو اب اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ خواہ برادرانِ وطن اس سے کتنی ہی چشم پوشی کیوں کریں یہ مٹ نہیں سکتی اور اس کی ہر دلعزیزی روز بروز ترقی کرتی رہیگی صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے دائرۂ ادب کو وسیع کرنے کے لئے جہاں سے بھی جو نئی چیز حاصل ہو سکتی ہے حاصل کریں اور زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق نئی ایجادات اور اختراعات کو معیوب خیال نہ کریں اس لئے گیت بےفائدہ چیز نہیں اور اس جگہ میں اپنے یو۔پی کے قدامت پرست بزرگوں سے اختلاف کروں گا جو یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو جب تک مختلف قیود سے جکڑی نہ رہے گی اس کی نجات ممکن نہیں (مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب مسٹر امتیاز علی تاج کا اردو ورس لیبر کا شاہکار "ہسپتال" رسالہ کارواں میں شایع ہوا تو بہت سے لوگوں نے اسے حجاب اسمٰعیل کی طرزِ نگارش کہہ کر رد کر دیا تھا) جس طرح اردو ادب کی صحیح نشو و نما کے لئے اس وقت غیر ملکی ادب اور خاص کر انگریزی ادب کے شاہکاروں کے تراجم کی ضرورت ہے اسی طرح اُردو شاعری کے لئے بھی گیت (یا ورس لیبر) کی قبولیت حاصل کر لینا بھی مضر یا غیر ضروری نہیں۔ ہاں ہمیں قدرے احتیاط سے کام لینا لازمی ہے۔ مثلاً ایک بزرگ احمدآباد سے اکثر ہندی گیت لکھا کرتے ہیں لیکن ان میں ہندی الفاظ اور ٹھیٹ ہندی الفاظ کی اس قدر بھرمار ہوتی ہے کہ خود مصنف کو گیت کے ساتھ ہندی الفاظ کی فرہنگ دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آخر ایسی شاعری کی کیا ضرورت ہے کیا مطالعہ کرنے والے اشعار کو پڑھیں یا غیر مانوس الفاظ کے معانی ڈھونڈھ کر ان کو ذہن نشین کرنا سیکھیں۔ اگر یہ گستاخی نہیں تو میں یہی کہوں گا کہ یہ محض اپنی ہندی دانی کا اشتہار دینا ہے اور شاعری کرنے کی بجائے ہندی کے ہر مشکل لفظ کا کاغذی جلوس نکالنا ہے پنجاب میں جہاں ہندی اور اُردو دونوں کو یکساں قبولیت حاصل ہے اس قسم کی بدعت کم کی جاتی ہے لیکن پھر بھی اکثر دفعہ نوجوان شعرا "بھول" جاتے ہیں اور جدت پسندی میں ہندی الفاظ خواہ مخواہ استعمال کرتے ہیں، اس کا نتیجہ بد اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر معمولی اور بالکل حقیر اشعار محض اس وجہ سے کہ وہ کسی گیت میں شامل کئے گئے ہیں۔ معتمد رسائل کے پورے صفحات پر مزین کئے جاتے ہیں اور اگر میرے ہندو دوست برا نہ مانیں تو یہ غلطی زیادہ تر انہیں سے سرزد ہوتی ہے بلکہ اکثر دفعہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ کیا ایسی ہی چیزیں ہیں جن پر ہندی ادب کو اس قدر ناز ہے لیکن مسرت ہے کہ میرا مطالعہ مجھے میں غلطی کا احساس فوراً ہی کرا دیتا ہے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ میں صرف اس قدر کہنا چاہتا تھا کہ چونکہ گیت ابھی اردو شاعری میں منتقل

[illegible] شاعرانہ جدت ہی سمجھا جاتا ہے اس لئے کئی دفعہ گیت لکھنے والوں کی تھوڑی سی چشم پوشی سے اردو رسم الخط میں لکھی ہوئی خالص [illegible] یہ نہیں تو نہایت ہی معمولی چیز ادب کا نقاب لیکر اُردو کی تذلیل کا باعث ہوئی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہمارے شعرا جس قدر جلد بھی اس [illegible] اُردو کے حق میں بہتر ہوگا

ابھی تک صرف مقفیٰ گیت ہی میرا موضوع رہے ہیں۔ لیکن میں اب غیر مقفیٰ نظم یعنی اُردو کی ورس لیبر کا ذکر کروں گا۔ یہ صنف قبول ہونے لگنے لگی ہے اور اگرچہ انجم اس طرف متوجہ ہو رہا ہے لیکن ادب نواز لوگوں کی اکثریت ابھی تک اس طرف شک کی نظروں سے دیکھتی ہے تاہم یہ کہدینا بے محل نہ ہوگا کہ یہ صنف جس قدر آسان معلوم ہوتی ہے اسی قدر مشکل ہے اور جس قدر مشکل ہے اسی قدر جذبات کی زیادہ ترجمانی کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ن۔م۔ راشد صاحب کی ہر نئی کوشش کا بعد شوق مطالعہ کرتا ہوں۔

غیر مقفیٰ گیتوں کا ذکر کردینے کے بعد میرا نفس مضمون لازمی طور پر مجھے نثر کے گیتوں پر لے آیا۔ ان کی ابتدا بھی ٹیگور کے نغموں سے ہوئی۔ بلکہ کچھ عرصہ تو ٹیگور کے گیت اردو نثر میں ترجمہ ہو کر مقبول ہوتے رہے۔ اور انھوں نے اُردو ادب کی اس خامی کو کسی حد تک پورا کیا بھی لیکن آخر کب تک؟ اردو میں بھی اس قسم کی اوریجنل کوشش لازمی تھی اور مجھے مسرت ہے کہ میں اس جگہ مسٹر عظیم قریشی کا ذکر کر رہا ہوں ان کے رادہا کے گیت بالکل ایک نئی اور اچھوتی چیز ہیں۔ میں اُن کا ٹیگور کے نغموں سے مقابلہ کرنا نہیں چاہتا لیکن یقیناً اس سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ رادہا کے گیت ادب کے ہر معیار پر پورے اترتے ہیں

گیت لکھنے والوں کے نام گنانا میرے لئے چنداں ضروری نہیں۔ اُن سے تقریباً ہر شخص واقف ہے تاہم حفیظ جالندہری مقبول حسین احمد پوری حفیظ ہوشیار پوری۔ امر چند قیس اور پنڈت اندر جیت شرما کا ذکر کردینا لاحاصل نہ ہوگا۔ حضرتِ حفیظ جالندہری کا ایک خاص معیار رہا ہے اور اُس کو قائم رکھنا انہیں کا کام ہے بلکہ اگر یہ بھی کہہ دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اُردو میں ترنم اور گیت کی ایجاد کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ مولانا مقبول حسین احمد پوری ہمایوں میں اپنی مخصوص طرز کے گیت اکثر بھیجتے رہتے ہیں۔ حفیظ ہوشیار پوری۔ امر چند قیس اور پنڈت اندر جیت شرما کا کلام بھی مختلف ممتاز رسائل میں شائع ہو کر بجا طور پر خراجِ تحسین وصول کر رہا ہے اور اب تو میرے دوست مسٹر ضیا فتح آبادی بھی اس طرف متوجہ ہو گئے ہیں دیکھئے اب محبت کے کون کون سے نغمے بے نقاب ہوتے ہیں

مقبول آلٰہی ایم۔ اے

گونڈوں کی شاعری

گونڈوں کی شاعری ادبِ لطیف کے اعلیٰ نمونوں اور مذہبی عنصر سے یکسر خالی ہے اُن کی شاعری زمین، آسمان اور ہواؤں کی شاعری تھی۔ پہاڑوں جنگلوں اور ندی نالوں کی شاعری تغیرات موسم اور متنوع جذبات انسانی کی شاعری، رقص سرود اور گانے بجانے کی شاعری تمام قیود اور پابندیوں سے آزاد نیچرل شاعری مشہور انگریز شاعر ورڈس ورتھ کا قول ہے کہ سیدھی سادھی دیہاتی زندگی میں مخصوص انسانی جذبات زیادہ نفاست سے بڑھتے اور نشوونما پاتے ہیں اور ان کا اظہار بھی زیادہ جوش کا پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ ان کے خلاف جن کی زندگیاں بعض پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ پہلے طریقے میں ہمارے بنیادی احساس بغیر کسی قسم کے تصنع کے قدرتی موحول میں پھولتے پھلتے ہیں اور قدرت کے حسین و جمیل اور سرمدی نظارے مستقل طور پر نظروں کے سامنے رہتے ہیں۔

گونڈ شاعر اپنے جذبات کا اظہار اکثر "ڈانڈا" پہیلی میں کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دادریا ہے۔ یعنی چھوٹا گیت لکڑہارا اپنے کام پر یار دوستوں یا آگ کے گرد بیٹھ کر عموماً دادریا ہی گاتا ہے کرما سب سے ضروری ہے۔ یہ اس ناچ کے وقت گایا جاتا ہے جس کو بہار کی آمد پر شادیوں کا ناچ کہہ سکتے ہیں۔

کرما گیت ہزاروں کی تعداد میں موجود ہوں گے۔ میں نے بڑی تلاش سے دو سو کرما جمع کئے ہیں۔ کرما گیتوں کے مطالب اکثر اُن کے گانے والے بھی نہیں سمجھتے۔ اس لئے ترجمہ کرنے میں مجھے بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اکثر گیتوں کے معانی سے صرف بڑے بوڑھے یا پیشہ ور گویئے ہی واقف ہیں۔ اکثر گیت سلیس ہیں۔ کہیں کہیں دل نواز درخشانی ہے اور بعض جگہ شاعر کا تخیل انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔ کرما گیتوں کے گانے کے لئے متعدد مُسر مقرر ہیں۔ جو خاص طریقوں سے مقررہ اوقات میں گائے جاتے ہیں، ان میں قافیہ عموماً نہیں ہوتا۔ اور الفاظ کی حرکات سے ترنم پیدا کر لیا جاتا ہے۔ کرما ناچ کے شروع میں مل کر گاتے ہیں اور بار بار دہراتے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی طویل یا مختصر نظم ہوتی ہے۔ نظم کے لئے کرما سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔

کرما ذیل کے طریقے پر ہوتا ہے:-

آدمیوں کا ایک گروہ ڈھولکیاں لے کر درمیان میں کھڑا ہوتا ہے اور عورتوں کی ایک قطار اُن کے آگے ناچتی ہے۔ جو تعداد میں کم و بیش ہو سکتی ہے۔ عورتوں کی قطار کی قطار کبھی ادھر جھکتی ہے کبھی اُدھر کبھی مردوں کے گرداگرد، کبھی کبھی دائرہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ چند لڑکیاں خود کو قطار سے علیحدہ کر لیتی ہیں اور تیزی سے [illegible] مردوں کے گرد مخالف سمت کو جاتی ہیں اور آہستہ [illegible] تیز [illegible]

ہوجاتا ہے۔ رقص کا ماہر ہاتھ پاؤں کی پیچیدہ اور مشکل حرکات میں کمال
دکھاتے ہیں۔ خصوصاً پاؤں کی حرکات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جب ناچتے ناچتے
آدھی رات ہوجاتی ہے، تو معمولی درجے کا رقاص بھی جوش میں آجاتا ہے اور
سب کے سب ناچ کی ترنگ میں مست و بے خود ہوجاتے ہیں۔ کبھی عورتیں گیت
شروع کرتی ہیں اور آدمیوں کو اسی بحر میں اُن کے سوالوں کا جواب دینا
پڑتا ہے۔ بڑا دلکش نظارہ ہوتا ہے جب چند ہوشیار اور ماہر عورتیں مردوں
کے ایک گروہ کو پریشان و بدحواس بنا دیتی ہیں کبھی آدمی شروع کرتے اور
عورتیں جواب دیتی ہیں یہ بات قابلِ غور ہے کہ شعرا میں عورتوں کی کثرت
ہے اور بہترین کرا گیتوں کی مصنف عورتیں ہی ہیں اُن کی شاعری رقص
سرود کی مترادف ہے' ایک زندہ شاعری، مسرت اور موسیقی کی شاعری'
خوبصورت چاندنی راتوں میں ڈھولوں کی کھڑک کے ساتھ خلخال اور
گنگھروں کی موسیقی نواز صداؤں میں اور پاؤں کی نازک حرکات کیساتھ
میری تفسیر میں شاعری۔ ایک گونڈ کہاوت ہے" ایک گونگا پرندہ خوبصورت
درخت پر بیٹھا ہے درخت کو ہلاؤ۔ پرندہ چونک پڑے گا اور گانے لگتا ہے"
اس کا جواب یہ ہے۔ ناچ کر جانے والی خوبصورت رقاصہ کے پاؤں میں پازیب
ہے۔

یہ نظمیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے دور
افتادہ دیہاتی آبادی کو انسان سمجھنا یا کم از کم ایسے ہی آدمی تصور کرنا جیسے
وہ خود ہیں محال ہے۔ ماہرین حیاتِ انسانی، کی کوششیں بھی ابھی
تفریق کو زیادہ ہی کرنے کا باعث ہوئی ہیں کیونکہ گاؤں کے غیر مہذب،
غیر تعلیم یافتہ آدمی کے عادات و اطوار اور توہمات و رسومات جب تمدن
کی روشنی میں لائے گئے تو وہ زیادہ مضحکہ خیز اور بدنما معلوم ہونے لگے
اور وہ سامان دل لگی بن کر رہ گئے۔ بعضوں نے اس پر رحم بھی کھایا مگر
اپنے ہی جیسے جذبات و احساسات رکھنے والا انسان انہی کو کسی نے نہ سمجھا

ان نظموں سے معلوم ہوگا کہ غیر مہذب باشندہ بھی اپنے نا مکمل اور عجیب غریب
علم اور انتہائی مفلسی اور جہالت کے باوجود انہیں حالات، واقعات اور اصولوں
کا پابند ہے جن کا نام مہذب انسان ہے۔ میرا خیال ہے ان نظموں کے پڑھنے
کے بعد ہندوستان کی جنگلی آبادی، کو صفر کا درجہ دینے والے اب زیادہ
محتاط ہوجائیں گے

کرما میں مختلف و متعدد موضوعات شامل ہیں قدرت کی حقیقی تصویر
اس میں جھلکتی ہے مثلاً کسی حسین دوشیزہ کے سرخ دوپٹے کا سورج
کی روشنی میں آگ کی طرح چمکنا، کیلے کے درختوں کے نیچے بہتی ہوئی آب جو
جنگل میں خوراک کے لئے زمین کریدنے والی مرغیاں۔ خاردار جھاڑیاں
چرتی ہوئی بکریاں، بارش اور بارش میں ڈھلی ہوئی کچی دیواریں۔ پانی
سے بھرے ہوئے پرشور نالے۔ بارش میں بھیگا ہوا مجبور عاشق دریا
کے کنارے پریشان کھڑا ہے۔ ہم کاشتکاروں کو دریا میں نہاتے دھوتے
اور مچھلیاں پکڑتے دیکھتے ہیں۔ جب کام کرتے کرتے ان کے جسم درد کرنے
لگتے ہیں اور وہ آرام کرنے کے لئے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آتے
ہیں۔ کھیتوں میں امرود اور مرچ کے ذخیرے کیا بھلے لگتے ہیں۔ باغ
آموں اور املی کے درخت سے لدے ہیں۔

"آم خوشوں کی صورت میں لٹک رہے ہیں اور املی کے درخت پھلوں سے لدے ہیں
جتنا رس پھل کے قریب ہوتا ہے ہماری محبت بھی اتنی ہی قریب ہے"
بہت سی نظموں میں پنگھٹ پر پانی بھرنے والی دوشیزاؤں کا ذکر ہے
"ایک خوبصورت اور نازک حسینہ کوئیں پر پانی لینے کے لئے گئی ہے۔
اُس کے سر سے پانی کا گھڑا اٹھا لے تاکہ اُس کو تکلیف نہ ہو
وہ گھڑا کاہے کا بنا ہے؟ اور یہ گھڑا کس قسم کا ہے
وہ گھڑا چاندی کا بنا ہوا ہے اور پانی کا گھڑا سونے کا ہے"
گاؤں کے گرداگرد ناگ پھنی کی مضبوط دیوار نظر آتی ہے۔ مور پر کو

پھیلائے ناچنے میں مصروف ہیں۔ گاڑیاں سڑک پر جا رہی ہیں، کتا چاند کی طرف دیکھ دیکھ کر بھونک رہا ہے اور لوگوں کو جگا رہا ہے۔ کبھی کبھی خود ناچ پر نظمیں لکھی جاتی ہیں۔

ناچنے والے ناچ میں مصروف ہیں اور لوگ اُن کے گرد جمع ہیں
چاندی کے زیورات سے آراستہ پاؤں کتنے خوبصورت ہیں
گھنگروؤں والے ٹخنے کس قدر پیارے ہیں،
اور ناچنے والے ناچ رہے ہیں اور لوگ اُن کے گرد جمع ہیں

جنگل اور سڑک کا ذکر گونڈوں کی شاعری میں بار بار آتا ہے ان دو چیزوں نے گونڈ شاعر کے تخیل پر کافی اثر ڈالا ہے کیونکہ، جنگل، محبت کی رازداری کا حامل ہے اور سڑک جدائی اور انتظار کی نشانی ہے

میرے سامنے ایک پہاڑ ہے۔ اس کے پیچھے ایک جنگل ہے
تم کہاں جا رہی ہو میری جان۔ مجھے بھی اپنے ساتھ جنگل کو لیتی چلو،
کیونکہ جس طرح خشک پتے۔ جنگل کی آگ میں جلتے ہیں،
اسی طرح میری زندگی تمہارے لئے جلتی ہے۔

جنگل پر خطر ہے ——— وہ چیتوں سے بھرا ہوا جنگل ہم کس طرح سلامت رہ سکتے ہیں، آہ؛ اور اکثر تنگ پہاڑیوں میں بھی چیتے کے پاؤں کے نشان نظر آتے ہیں، لیکن ایک نظم میں لڑکی فخر کرتی ہے۔ کیونکہ اس کا عاشق ان خطرات کا دلیرانہ مقابلہ کر سکتا ہے۔

"میری زندگی تنہائی میں بسر ہوتی ہے۔ جنگل میں بانس کاٹتے، گھر میں نہیں ڈرتا۔"

کیونکہ جنگل ادھر ہی ہے، دلکش جنگل حسن اور مسرت کا جنگل
اے جنگلی پرندے، اے جنگلی پرندے، کیا تجھے اپنے پاؤں کے لئے گھنگرو کی ضرورت ہے؟ کیا تجھے گلے کے لئے مالا کی ضرورت ہے؟ کیا اس خوبصورت جنگل میں تم ان کی قیمت کہاں سے دوگے؟ اے جنگل کے پرندے،

لیکن جنگل کی سڑک جدائی کی جگہ ہے، جدائی اور موت کی ہیبت اکثر نظموں میں موجود ہے۔

موت تیرے جسم پیکر میں داخل ہو جائیگی جو اس قدر حسین ہے
اے بھائی ہمارے ان شیریں زندگانیوں کے لئے علیحدگی ضروری ہے
میرے جسم کا ہر حصہ تیرے لئے رو رہا ہے۔
میرا دل دھڑک رہا ہے موت قریب ہے
اور میرا دل اس غم جانکاہ میں گھل رہا ہے
آہ تیرے جسم کے لئے موت ضروری ہے تیرا جسم جو مجھے اس قدر عزیز ہے

موت سے مفر نہیں، اُس آدمی کی طرح جو پانی سے لبریز ندی کو عبور کرنے کی کوشش کرتا ہے یا اُس آدمی کی طرح جو اونچے درخت سے گرتا ہے موت لابدی ہے، اور اس عمر دوروزہ کے ختم ہونے کے بعد ہم کو اس سڑک پر تنہا سفر کرنا پڑیگا۔ زندگی داستان غم ہے، آنسوؤں اور دکھوں سے بھری ہوئی۔

رنج و الم کے آنسوؤں کی گہرائیوں کی پیمائش کسی نے نہیں کی
پہاڑ اور پہاڑیاں بہ جائیں۔ آنسوؤں کا دریا اب تلاطم خیز ہے
اے بھائی اگر میں ایک آنسو کا قطرہ ہوتا تو ایک سرے سے بہتا ہوا دریا ہوتا
کیونکہ غم کے آنسوؤں کی عمیق گہرائیاں انتہا ہیں۔

غریب جنگل کے باشندے کی کسی کو پروا نہیں، دنیا نے اُس کو بھلا دیا ہے زندگی دشمنوں اور مصائب سے بھری ہے۔ یہاں ایک تنہائی کے متعلق خوبصورت نظم ہے۔

اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ نہ کوئی اُس کا مربی تھا،
وہ ایسے جنگل میں پہنچا جو گھنے جنگلوں میں گھرا ہوا تھا،
وہاں سے ایک آدمی ملا جس نے ایسے [illegible]

[illegible] نے کہا، میری طرف ایسی بُری طرح نہ دیکھ،
میں اپنی زندگی کے باقی دن بھی دوست کے بغیر گذار دوں گا
کل یا اگلے دن میں مر جاؤں گا
اور میری چھاتی پر گھاس اُگ آئے گی
یہ زندگی جسم میں صرف دو دن کے لئے رہتی ہے
پس مجھے ایسی بُری نظروں سے نہ دیکھ

ایک اور غم انگیز گیت ہے۔

میں بُری خبر لے کر آیا ہوں
اُداس دل کے ساتھ تمہارے دروازے پر کھڑا ہوں
لیکن تمہیں میری آہ و زاری کی کیا پروا
کیونکہ تم اپنے محبوب کے ساتھ ہو
لیکن میں تمہارے دروازے پر مایوس تمنائیں لئے کھڑا ہوں

ایک عام موضوع عاشق و معشوق کی جدائی سے متعلق ہے

میں تجھے اپنے خوابوں میں تلاش کرتا ہوں
لیکن میں تیرے پاؤں کی آہٹ کی بازگشت بھی نہ سن سکا

یہ گاڑی ہوا کی طرح دوڑ رہی ہے
میرے مالک ٹھیرو ایک وقفہ کے لئے ٹھیرو
تمہاری محبوبہ کا دل تمہارے لئے رو رہا ہے

اس محبوبہ کے لئے کوئی راحت نہیں نیند نے اس کے بستر سے علیحدگی اختیار کر لی ہے
وہ گھر کو صاف کرتی ہے مگر اس سے زیادہ مٹی اُس کے دل پر جمی ہے
کیونکہ اُس کی زندگی کا ساتھی اس سے جدا ہو گیا ہے
[illegible] اس کے لئے چین نہیں اس کی نیند حرام ہو چکی

وہ لڑکی جو بہت دنوں گاؤں میں رہی، آخر شادی کے بعد سسرال چلی گئی

طلب معاش اکثر عاشق و معشوق کی جدائی کا باعث ہوتی ہے۔

شاعر آقا کو کہنے لگتا ہے محبت ایک عجیب قسم کی جلن سی پیدا کرتی ہے
"دریا متواتر بہتا جا رہا ہے۔ اسی طرح میرے آنسو ہمیشہ بہتے رہیں گے
اے میری محبوبہ! ان جذباتِ محبت کے لمحوں کو نہ بھول"
کیونکہ ہماری محبت کی یادگار اب یہی لمحات ہیں جو ہم سے چھن چکے،
محبت ایک دریا ہے جو پیچ و خم کھاتا ہوا بہتا ہے"

یہ ایک گیت کا مطلع ہے اکثر گیتوں میں غم و الم کو مجسم کر دکھایا ہے اور ان پر جاپانی گیتوں کا شک ہونے لگتا ہے، ایک دنیائے غم، صرف ایک یا دو سطروں میں بیان ہو جاتی ہے۔

باہر بارش موسلادھار ہو رہی ہے
اور گھر میں ایک لڑکی آنسوؤں کی لڑیاں پرو رہی ہے

کیا اس سے مکمل اور عمدہ تصویر غم کھینچی جا سکتی ہے؟ ایک اور سنئے:-

تم بھول گئی ہو جو کچھ تم نے کہا تھا، آم کے درخت کے نیچے
آہ! تم کیوں بھول گئی ہو،

اس کپڑے کو نہ کھو دینا، جو میری چھاتی ڈھانپتا ہے
ورنہ آخرکار اسکو کھونے کے بعد تم اداس ہو گے

تم کہیں بھی جاؤ، تم سارے جہان کے راستوں پر پھرو
لیکن اے میری جان۔ میں تم کو پا ہی لوں گا،

لیکن تمام گیت ایسے نہیں ہیں ان میں کافی ظرافت موجود ہے بلکہ اکثر جگہ تو عریانی بھی ہے اعلیٰ طنزیہ اشعار کی بھی کثرت ہے، ایک غلط فہمی میں مبتلا لڑکی بازار کو جاتی ہے۔

اُس کے بھدے پاؤں میں خلخال ہے اور اس کی ترچھی آنکھیں کھیں ہیں
اُس کے پھٹے ہوئے کانوں میں بالیاں ہیں

اُس نے سفید بھڑکیلا لباس پہن رکھا ہے اس طرح وہ بازار جاتی ہے
ایک دیہاتی گنوار کی بہت عمدہ تصویر کھینچی ہے
اس کی کلائیوں میں موٹے چاندی کے کنگن ہیں
اُس کے کانوں میں سونے کی بالیاں ہیں۔
اُس کے منہ سے سُرخ پان کی دھار بہتی رہتی ہے

اہیر (گوالا) اپنا سارا دن باتوں میں گذارتا ہے۔ اُس کی گائیں جنگل میں چرتی ہیں۔ ایک نظم میں پولیس کے سپاہی کا ذکر ہے

کسی کو وہ قید میں ڈالتا ہے۔ کسی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہناتا ہے
وہ چور کو قید میں ڈالتا ہے۔ وہ گونڈوں کے سامنے ہتھکڑیاں بجاتا ہے
نیکوں اور بے گناہوں کو بھی وہ متواتر ستاتا رہتا ہے۔

جس چیز میں گونڈوں کی شاعری سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ وہ غزل یعنی محبت کی شاعری ہے، اُس کی طرف آج تک ادیبوں نے بہت کم توجہ کی ہے۔ مسٹر رسل نے چند گیتوں کا ترجمہ کیا، جن میں صرف ایک بہترین کہلا سکتا ہے۔ اُن کی رائے میں سوائے بعض چیزوں کے گونڈوں کی شاعری صرف عشقیہ شاعری ہے۔ مسٹر ٹرنچ نہایت سادگی سے کہتے ہیں "بد قسمتی سے گونڈ یہ کبھی نہیں چاہتے کہ اُن کی شادی بیاہ کے گیت منصئہ شہود پر لائے جائیں۔ چنانچہ میں نے اس کی کوشش نہیں کی، ورنہ ان گیتوں میں بھی بڑے بڑے گوہر تابدار موجود ہیں" کیا شادی بیاہ کے متعلق شیکسپیر کا خاص نظریہ اس کے ڈراموں کی اشاعت کو روک سکتا ہے کیا عہد الزبتھ کا تمام ادب محض عشقیہ کہلا سکتا ہے؟ کہ ان گیتوں میں بعض ثقیل اور سوقیانہ بھی ہیں۔ مگر میرے پاس ایک سو ایسے گیتوں کا ترجمہ موجود ہے۔ جن کی اشاعت سے

چند [illegible] Puritan) ہستیوں کے سب [illegible] یہ نظمیں جیسا کہ میں نے کہا ہے عریاں اور ناشائستہ ہیں [illegible] اور جو شیلی ہیں ان میں افلاطونی فلسفے کی بُو بھی نہیں۔

جو کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے، اگر وہ محبت کا اس کے صحیح انجام تک نہیں پہنچاتا تو وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص سمندر کی طرف صرف سمندری بیماری کے لئے جاتا ہے۔

مجھے عہد الزبتھ کی اصلی معنوں میں عشقیہ شاعری کا بار بار خیال آتا ہے کہ کیا ایسی نظمیں ہیں جیسی ملٹن کے قول کے مطابق ہونی چاہئیں، سادہ، موثر حواس اور جذبات سے مملو۔ وہ اُن کے جذبات اور تمناؤں کے تناقص نہیں بلکہ نشاط آور بے خودی طاری کر دیتی ہیں۔ یہ گیت ایسے نہیں ہوتے جو عموماً شادیوں پر گائے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ذکر عشق و محبت مغرب کی طرح درستانہ شادی پر منتج نہیں ہوتا۔ شادی کے متعلق گونڈ قوم کا نظریہ بہت بلند ہے۔ مرد عورت اس لئے شادی کرتے ہیں کہ اُن میں باہم محبت ہوتی ہے۔ اس لئے نہیں کرتے کہ ان کے والدین اس کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ شادیوں میں گراں بار اخراجات اور عیش و نشاط کے سامانوں کی فراوانی نہیں ہوتی، گونڈ شادی کرنے کے لئے قانوناً مجبور ہیں۔ . . . .

جب گونڈ لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے اور بچے ہو جاتے ہیں تو بہت وفادار، مطیع بن جاتی ہے وہ بہترین ماں اور عمر بھر کی ساتھی ہوتی ہے۔

عشقیہ شاعری :-

ہر چھوٹے کوچے میں ایک باغ ہے
ہر گاؤں میں بھوکے [illegible] ہیں
سب کے اپنے باغ میں تھوڑی سی [illegible]
کھاؤ، پیو، گو —— [illegible]

[illegible] میں آرام کرنے دو
[illegible]
میری چھوٹی گھڑیاں گذر گئیں
تمہارے لئے رات کی طویل گھڑیاں موجود ہیں،

آؤ میری محبوبہ گھر چلیں اور آرام کریں
خدا کی عطا کی ہوئی رات صرف نیند اور کھانے میں بسر نہیں کی جا سکتی
یہ ہمارا شاندار گھر ہے۔ جہاں گرمی اور راحت ہے
آؤ گھر چلیں اور سو جائیں،
ایک جگہ تمہارے باپ کے لئے ہے، ایک تمہاری ماں کے لئے، ایک تمہارے لئے
آؤ... ....

وہ اپنے گھر کے پچھواڑے کپڑے سکھا رہی ہے
مجھے جذباتِ محبت کا احساس ہے
وہ محبت جس سے میرا دل لرز رہا ہے
وہ حیران کن محبت، عجیب و غریب محبت
میں اُسے نہیں بھول سکتا

میری محبوبہ تلوار لیکر ہمیشہ میرے سر پر چمکتی ہے
میں نے چوری نہیں کی۔ میں نے محبت کی چوری نہیں کی
اے سب گناہ ہستی، مجھے ایسی تلوار سے بچالے

جس طرح برتن میں دودھ خراب ہو جاتا ہے
جس طرح چاندی سیاہ ہو جاتی ہے
اسی طرح میری محبت، جسے میں نے اپنی قوت سے حاصل کیا تھا۔
پاش پاش ہو گئی۔ کیونکہ تم نے بے وفائی کی

اے کوئل میرا پیغام لے جا۔ وہ باغ میں ہوگی،
منتظر، آہ کس طرح پیغام بھیجوں
وہ باغ میں میری منتظر ہے
اے طوطے، تو ہی میرا پیغام وہاں تک پہونچا دے
اے کوّے، تو ہی لے جا۔ اور تو کوئی نہیں لے جاتا،
وہ باغ میں میری منتظر ہے۔

یہ اور اسی طرح کی بہت سی عمدہ عمدہ نظمیں ہیں، میں نے بہت سی چھوڑ دیں ہیں اور ابھی بہت سی ایسی ہونگی جن کے جواہر پاروں کی چمک سے سرور حاصل کرنا کسی اور کی قسمت میں ہوگا، مجھ سے جہاں تک ہو سکا میں نے یہ جواہرات جمع کرنے میں بہت کوشش سے کام لیا، یہ اُس بھولی بھالی، غیر مہذب قوم کی شاعری ہے جسے ہندوستان کا ممتاز طبقہ ہندوستانی ہی خیال نہیں کرتا۔ جن کو اچھوت اور ہریجن وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اُن سے گونڈوں کا درجہ کسی طرح بلند نہیں، کیا ہمارے دل ہمیشہ کے لئے احساس سے محروم ہو گئے ہیں۔

سالک صہبائی۔ بی۔ اے

شاعر اور حسن

وہ نزدیک و دور حسینہ کے نام سے مشہور تھی۔ قدرت نے اُسے ایسا حسن عطا کیا تھا کہ باید و شاید اس کے حسن و جمال کے چرچے ہر گھر میں تھے۔ وہ اس پھول کی مانند تھی جس کی مہک ہر نوجوان کو جس کے پہلو میں اُمنگ بھرا دل ہو مسحور کر دیتی ہے۔ وہ اس چراغ کی طرح تھی جس کے شعلے پر سب سے پہلے مر مٹنے کے لئے پروانوں میں کشمکش ہوتی رہتی تھی۔ وہ ایک ریاضِ طور تھا اور اس پر سب کو فدا ہو جانے کی ہوس تھی۔ وہ اس ستارے کی طرح لمعہ افگن تھی جسے دیکھ کر قافلے والوں کو اپنی منزل کا نشان ملتا تھا۔ وہ ایک نایاب گوہر تھی اور سب اس کے طلبگار تھے لیکن قسمت نے اپنا پانسہ ابھی تک نہیں پھینکا تھا ؎

درجہاں مثلِ چراغ لالۂ صحراستم
نے نصیبِ محفلے نے قسمت کاشانۂ

حسینہ چونکہ ایک عورت تھی اس لئے ہر ایک کو خیال تھا کہ وہ ایک نہ ایک روز شادی کر لے گی۔ گوہر جب تک تراش کر درست نہ کیا جائے۔ جوہری اُس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ پھول جب تک شاخ سے جدا ہو کر کسی کا زیب گلو نہ ہو اس کی مہک اور خوشبو کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ اسی طرح جب تک عورت مرد سے رشتۂ اخوت قائم نہ کرلے اُس کے جوہر اور خوبیاں کسی پر نہیں کھلتیں۔ حسینہ کے پاس نئے دن شادی کے پیغام آتے تھے۔ لیکن ع

وہاں ایک خامشی مرے سب کے جواب میں

اس کی اس بے اعتنائی اور سرد مہری کے باعث عوام میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ لوگ سمجھنے لگے کہ اس کے پہلو میں دل نہیں پتھر کا ایک ٹکڑا ہے۔ کوئی دیوانی کہتا کوئی نمرودِ حسن کا طعن دیتا۔ کوئی کہتا کہ وہ دولت کے گھمنڈ میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتی اور کوئی مشتاق جمال اس بے اعتنائی کو عمر کا تقاضا اور الھڑپن کی ایک ادا تصور کرتا۔ الغرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔

لیکن مشکل صرف اتنی تھی کہ وہ جو اُس کے قدردان بنے پھرتے تھے۔ انہیں وہ قدر دان نہیں سمجھتی تھی۔ وہ نادانوں سے اپنی تعریف سُن کر پریشان رہتی۔ وہ اُن نوجوانوں سے سخت بیزار تھی جو طرح طرح اپنی بیتابیوں اور بیقراریوں کا اظہار کرنے اور اپنی گوں سے بھی نفرت تھی جو اتراتے تھے۔ اور ایسے طلبگار بھی اسے پسند نہ تھے جو دائمی اُلفت کی قسمیں کھاتے تھے۔

ایک روز ... کے ... بازاروں میں چھوٹی چھوٹی ندیاں ... [illegible]

...کی پرچھائیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے فلک بوس پہاڑ چاروں طرف سے پھیلے ہوئے تھے تین مسافر مختلف راستوں سے آئے۔ اُن میں سے ایک بھاری بھرکم تنومند شخص تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے تھے۔ اُس کی آواز بہت کرخت تھی۔ اس کا چہرہ تانبے کی طرح چمکتا تھا۔ اُس کی کمر سے ایک بھاری تلوار بندھی ہوئی تھی اور گلے میں ایک ہلال نما خنجر آویزاں تھا۔ اُس شخص کو دیکھتے ہی دل میں خوف اور ہراس سا پیدا ہونے لگتا۔ یہ ملک کا مشہور ڈاکو تھا اور لوگ اس کا نام سُن کر سہم جاتے تھے

دوسرا مسافر چہرے بشرے سے ایک جری اور بہادر آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بات بات سے شجاعت ٹپکتی تھی اس کی شجاعت اور بہادری کی داستانیں ہر کہ ومہ کی زبان پر تھیں۔ لوگ اسے عزت کی نگاہوں سے دیکھتے۔ اور اُس کی باتیں بہت شوق سے سنتے۔ وہ ایک ٹمکین گھوڑے پر سوار تھا۔ جدھر سے گذرتا اُس پر پھول برسائے جاتے اور خوشی کے نعرے بلند ہوتے۔ یہ شخص اس ملک کا ایک مشہور سپاہی تھا اور لوگوں کو اس پر ناز تھا۔

تیسرا مسافر ایک خوش پوش اور خوش وضع نوجوان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک قدرتی حجاب تھا اُس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اُس کے دیکھنے کا انداز کچھ ایسا دلفریب تھا کہ بار بار اُسے دیکھنے کو دل چاہتا تھا۔ اُس کی آواز میں سوز بھی تھا اور ترنم بھی یہ نوجوان بربط بجاتا ہوا شہر میں داخل ہوا۔ بربط کے دلنواز نغموں نے جدھر سے وہ گذرا لوگوں کو مسحور کردیا یہ شاعر تھا۔

تینوں مسافر اتفاق سے ایک ہی جگہ آکر ٹھہرے۔ یہاں بھی اس حسینہ کے حُسن وجمال کے تذکرے ہو رہے تھے نووارد بڑے شوق اور توجہ سے لوگوں کی باتیں سُننے لگے۔ آخر آتشِ شوق سے بیتاب ہو کر تینوں اس کے محل کی جانب چل دئے۔ بہت سے لوگ بھی تماشہ دیکھنے کے لئے ساتھ ہو لئے

حسینہ کا محل ایک چھوٹی سی پہاڑی پر تھا۔ مشاطۂ قدرت نے زمانہ بھر کی دلفریبیاں یہاں جمع کردی تھیں محل کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی ندیاں سیماب کی طرح چمکتی ہوئی اور محل کے گرداگرد گھومتی ہوئی اور پیچ وخم کھاتی ہوئی مرغزاروں کو سیراب کرتی چلی جاتی تھیں۔ عشق پیچاں اور خودرو گلاب کی بیلوں نے چٹانوں پر ایک خوبصورت جال بچھا رکھا تھا۔ اور ڈیلیا کے دلفریب پھول کسی مشتاق جمال کی طرح چٹانوں سے جھک جھک کر محل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ محل کے سامنے ایک چھوٹا سا سرسبز میدان تھا جس پر فرشِ زمردیں کا دھوکا ہوتا تھا۔ ڈاکو، سپاہی اور شاعر اس میدان میں آکر بیٹھ گئے

اس زمردیں میدان کی جانب محل کی متعدد کھڑکیاں اور جھروکے تھے۔ اُن کے آگے خوبصورت پردے آویزاں تھے۔ ان کھڑکیوں میں اس ملکۂ حسن کی سہیلیاں بیٹھا کرتی تھیں۔ ان کھڑکیوں سے کچھ اوپر ایک اور جھروکہ تھا۔ اس کے سامنے سنگ مرمر کا ایک خوبصورت کٹہرا تھا اور جا بجا سیم وزر سے گل کاری کی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے مختلف رنگوں کے موتیوں کا ایک بہت خوبصورت پردہ آویزاں تھا اور وہ ملکۂ حسن اس پردے کے پیچھے سے موسم بہار کی دلربائیوں کا نظارہ کیا کرتی تھی محل کی کھڑکیاں کھول دی گئیں اور ہر کھڑکی میں سے بربط اور چنگ کے دلنواز نغموں سے گونج کر ... کہ ملکۂ حسن کی فرمانرواؤں کی تسخیر کے لئے تخت پر جلوہ افروز ہوگئی ہے

اے ملکۂ حسن! میں تجھے سلام کرتا ہوں اور تیرے اقبال کی ترقی چاہتا ہوں۔ لیکن میں اُن لوگوں میں نہیں۔ جو خالی بیٹھ کر [illegible] جو ہر دیکھنے کا موقع ملے۔ لوگ مجھے ڈاکو کہتے ہیں۔ اور مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن کبھی تو نے بھی میرے کارنامے سُنے؟ یہ سچ ہے کہ میں [illegible] اور جہاں میرا گذر ہوتا ہے۔ قتل و غارت کا میدان گرم کر دیتا ہوں۔ لیکن کیا تجھے معلوم ہے کہ میں کن لوگوں کو لوٹتا ہوں۔ اور کون [illegible] ہوتے ہیں؟

میں ان دولت مندوں کو لوٹتا ہوں۔ جنہوں نے غریبوں کا خون چوس چوس کر دولت جمع کی ہے۔ لیکن نادار اور غریبوں پر ترس نہیں کھاتے یتیم بچوں کو بھوکے اور ننگے دیکھ کر اُن کا دل نہیں پسیجتا میں جو کچھ لوٹتا ہوں ناداروں اور مفلسوں میں بانٹ دیتا ہوں۔ میری تلوار ان ظالم اور بے رحم لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارتی ہے جو کمزور اور ناتوانوں پر دست ظلم دراز کرتے ہیں۔

تو اے ملکۂ حسن! اب ذرا پردے کو سرکائے اور مجھ کو اپنے جمالِ جہاں تاب کی ایک جھلک دکھائے۔ میں تیرا پرستار بن گیا ہوں اور تجھے اپنی محبوبہ بنانے کی آرزو رکھتا ہوں۔

ڈاکو کچھ دیر پردہ اُٹھنے کا انتظار کرتا رہا اور پھر گرج کر بولا۔

"تو مجھ کو حقیر نہ سمجھ ظالم سے ظالم اور جابر سے جابر آدمی میرا نام سُن کر سہم جاتے ہیں تو میرے غضب اور غصے کا نپ۔ یاد رکھ جس طرح تیرے خدام گوسفند کے گلے پر اطمینان سے چھری چلاتے ہیں۔ اسی طرح میں بھی اپنے دشمنوں پر قابو پا کر مزے مزے سے اُن کو ذبح کرتا ہوا اُن کو اپنی آہنی گرفت میں بے دست و پا دیکھ کر میرے دل میں خوشی اور امنگ پیدا ہوتی ہے۔ اُن کو خنجر کے نیچے تڑپتے دیکھ کر مجھے ایک قسم سرور اور کیف حاصل ہوتا ہے"

یہ کہہ کر وہ جھروکے کے نیچے آکر کھڑا ہو گیا۔ اور نیام سے تلوار کھینچ کر اور نیزا جا کر بولا۔

وہ اسے دیکھ! یہ سینکڑوں کا خون پی چکی اور ابھی تک تشنہ لب ہے۔ جس شخص نے میری مخالفت کی اور مجھے حقیر سمجھا اس بدبخت زمانے نے آنسو بہائے اور بیکسی نے اس کا ماتم کیا۔ سُن! میں اپنی بات جبر سے منوایا کرتا ہوں، لیکن جب فتح میں زور اور طاقت سے کسی فتح پاتا ہوں تو پھر رحم اور نرمی میرے دل سے اس طرح دور ہو جاتا ہے، جیسے بیاباں سے گردم آہو "

آناً فاناً محل کا دروازہ کھلا اور ایک دیو نژاد خونخوار حبشی باہر نکل کر بولا:۔

"شیخی باز اور ذلیل ڈاکو! خاموش، خبردار جو اب تیری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا"

ڈاکو اس خونخوار حبشی کو دیکھتے ہی گربہ مسکین کی طرح ایک طرف دب کر بیٹھ گیا۔

اب سپاہی اپنی جگہ سے اُٹھا اور جھروکے کے سامنے کھڑے ہو کر ایک وقار کے ساتھ کورنش بجا لایا اور بولا۔

"اے ملکۂ حسن! اپنے جانباز اور بہادر سپاہی کی طرف دیکھ۔ اور وطن کی جو خدمت میں نے کی ہے [illegible]

[illegible] سکے لئے تو دشمن کے زخم میں نے کھائے ہیں [illegible]

[illegible] میں جھوٹی بات کرنی نہیں جانتا۔ صرف تلوار چلانا جانتا ہوں۔ اور قوم اور وطن کی عزت اور آبرو پر سر کٹوانا فخر سمجھتا ہوں۔
[illegible] وہ قوت عطا کی ہے کہ لوہا بھی میرے ہاتھ میں موم ہو جاتا ہے۔ مجھے وہ حوصلہ عطا ہوا ہے کہ میں خوف اور مشکل کو کبھی خاطر میں
[illegible] اگر لب ہے تو اپنے دست و بازو پر ناز ہے تو اپنے حوصلے اور ہمت پر

کاش! تو کبھی اُس وقت کا نظارہ دیکھے جب میں فاتح ہو کر شہر میں داخل ہوتا ہوں۔ میرے خیر مقدم کے لئے کوچہ و بازار میں لوگوں کے جمگھٹے لگے ہوتے ہیں۔ عورتیں عقیدت اور مالا کی مجھ پر بارش کرتی ہیں۔

تو اے ملکۂ حسن! اگر تو سپاہی کی دلہن بننا پسند کرے گی۔ تا کہ ملک کی عورتیں تجھ پر رشک کریں۔ تو پردے کو ہٹا اور اپنے جمالِ جہاں سوز کی ایک جھلک اپنے بہادر سپاہی کو دکھا۔

محل کا دروازہ کھلا اور ایک غلام جواہرات کا ایک بیش قیمت ہار اندر سے لایا اور سپاہی کے گلے میں ڈال کر کہا۔

" لے! یہ تیرا انعام ہے"

سپاہی مایوس ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

اب شاعر اپنی جگہ سے اُٹھا اور جھروکے کے سامنے گردن جھکا کر اور ایک ہاتھ سینہ پر رکھ کر کورنش بجا لایا اور بولا:۔

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

اُس کی آواز سنتے ہی محل کے مکین ہمہ تن گوش ہو گئے۔ شاعر دو چار قدم ہٹ کر ایک زانو فرش پر ٹیک کر بیٹھ گیا اور بربط بجانے لگا۔ پھر گانے لگا اُس کی پرسوز آواز نے بربط کے دلنواز نغموں کے ساتھ مل کر سننے والوں کو مسحور کر دیا۔ اُس نے ایک گیت گایا۔

"اے ملکۂ حُسن! غربت میں وطن کی یاد جس طرح دل کو تڑپاتی ہے اسے وہی خوب سمجھتا ہے۔ جسے دیارِ غیر میں زندگی کی بے کیف گھڑیاں بسر کرنے کا اتفاق ہوا ہو۔ ... لیکن تجھے کچھ معلوم بھی ہے کہ میرا وقت کیسے کٹا؟ یہ مجھ سے سُن...... ہاں!

تیری یاد میں اور تیرے خیال میں۔ ...

اور تجھے پھر ایک بار دیکھنے کی تمنا میں۔ اس یاد اور تمنا میں میرا وقت کٹا اور سفر کی مصیبت میرے لئے سامانِ راحت بن گئی ——"

کھڑکیوں کے سامنے کے پردے دفعتاً ہلنے لگے۔ شاعر پھر بولا:۔

اے ملکۂ حسن! میں تجھے اپنی زندگی کا ایک خوشگوار واقعہ سناتا ہوں۔

مدت ہوئی کہ میں وطن سے دور ایک طویل سفر کی پرصعوبت منزلیں طے کر رہا تھا۔ ایک روز ایک ویرانے میں سے گزر رہا تھا۔ میں تھکا ماندہ تو تھا ہی ایک درخت کے نیچے سستانے کے لئے بیٹھ گیا کچھ دیر بعد ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ اور کسی پھول کی بھینی بھینی خوشبو سے میرا دماغ معطر [illegible] اس پھول کو ہر جگہ جہاں سے گزرا ہوا ڈھونڈا۔ لیکن ہمیشہ بے نیل و مرام رہا لیکن ایک روز میں نے اسے پا ہی لیا۔ [illegible] بتاؤں میں نے [illegible] آج پھر ایک بار اس پھول کی مہک میرے دل و دماغ کو معطر کر رہی ہے —— اے حورِ کشور [illegible]"

کھڑکیوں کے پردے زور زور سے ہلنے لگے اور کہیں کہیں سے تحسین و آفریں کی آواز بھی سنائی دی۔

شاعر کچھ دیر بربط بجاتا رہا۔ اُس کے تاروں کے نغمے پیغامِ حیات دے رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور پھول اور پھل مستی کے [illegible] تھے اُس نے پھر کہا۔

اے ملکۂ حسن! اب میرے بچپن کا ایک واقعہ سُن...... ......

چاندنی راتوں میں پلنگ پر پڑا چاند کو بڑے تعجب سے دیکھا کرتا تھا۔ مجھے اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی کچھ ایسی پیاری معلوم ہوتی تھی کہ آنکھیں بند کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ میں چاند کو گاہے بادلوں کے اندر چھپتے اور گاہے عریاں ہوتے دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ اور اکثر باجی سے پوچھا کرتا کہ چاند کا مسکن کہاں ہے؟

لیکن اے ماہ جبیں! آج کوئی میری مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ کیوں؟ ...... اس لئے کہ میں نے چاند کا مسکن پا لیا...... میرا چاند...... ...

میرا خوبصورت چاند موتیوں کے اس خوبصورت پردے کے پیچھے جو تیرے جھروکے کے سامنے آویزاں ہے چھپا بیٹھا ہے اور کوئی دم میں اسے باہر نکلنا چاہتا ہے جب میرا چاند جلوہ افروز ہوگا تو میں کبک دری کی طرح اُس پر نثار ہوا کروں گا...... میری خوشی کی ابتدا اور انتہا تیرے جمالِ جہاں تاب پر موقوف ہے......

"آ! میں تیری نذر کو ایک ایسا دل لیکر آیا ہوں جس میں تیری محبت کی شراب چھلک رہی ہے۔"

کھڑکیوں کے پردے اُٹھ گئے اور ہر کھڑکی میں سے شاعر پر پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ پھر محل کا دروازہ کھلا اور حور وکنش حسینہ اپنی سہیلیوں کی جھرمٹ میں پھولوں کا لباس پہنے باہر آئی۔ شاعر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی اس کے پاس آئی اور اپنے گلے سے پھولوں کا ایک خوبصورت ہار اُتار کر شاعر کے گلے میں ڈال دیا۔

کھڑکیوں میں سے دونوں پر پھول برسنے لگے۔

ایم اسلم

آئینۂ جذبات ——— (چند رباعیاں)

صحرا دیکھا، فروغِ گلشن دیکھا
لبریز اُمید دل کا دامن دیکھا
میری ہی نشاط روح ہے ماجی یہ بھی
انسان کو انسان کا دشمن دیکھا

جب بھی وہ گل بہار بن جاتے ہیں
ہر پارۂ صد شرار بن جاتے ہیں
اکثر ایسا بھی دور آجاتا ہے
ہم اک زندہ مزار بن جاتے ہیں

رنگینیٔ صد گلاب بن جاتا ہے
اک جنبش ماہتاب بن جاتا ہے
پہنچے ہیں قدم نازنیں جب اُن کے
ہر ذرہ اک آفتاب بن جاتا ہے

ہے کوئی شرابِ غم پلانے والا
کوئی دنیا سے ہے مٹانے والا
ہیں سیکڑوں [illegible] پھولے
مفتی نہ کنول دل کا [illegible]

آنکھی ہے [illegible] عشرت میری
بن کر بگڑی ہے او قسمت میری
ماجی نہیں مجھکو دو جہاں کی [illegible]
لیکن دنیا کو ہے ضرورت میری

وکٹر ہیوگو

فرانس کا مایۂ ناز شاعر و مفکر وکٹر ہیوگو پیرس میں ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوا، اس کا باپ فوج میں جنرل تھا، مگر اس کا دادا بڑھئی تھا اور اسکے آباؤ اجداد زمین کی کاشت کیا کرتے تھے۔

عہدِ طفلی میں جیسا کہ وکٹر ہیوگو خود بیان کرتا ہے، اُس کے تین اُستاد تھے۔ باغ، ایک بڑھا پادری اور اُس کی والدہ، مگر وہ اپنے اندر ایک قوت پوشیدہ رکھتا تھا جسے ہم "شہرت کا تخم" کہہ سکتے ہیں، پندرہ سال کی عمر میں اُس نے فرانسیسی اکیڈمی کے پاس اپنی ایک نظم بھیجی، جس پر اُسے (Enfant Sublime) کا خطاب ملا، اسی طرح ایک اور نظم پر جو ایک سو بیس اشعار پر مشتمل تھی اور جو ایک ہی نشست میں قلمبند کی گئی تھی، انعام ملا۔ اس کی لڑکپن کی تحریر میں روانی و پختگی کا ہونا اس کا ترجمان تھا کہ وہ کسی روز اقصائے مغرب میں اپنے نام کا ڈنکا بجوائے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ دُنیائے ادب نے اُسے اُنیسویں صدی کا لاثانی شاعر تسلیم کیا

۱۸۲۲ء میں اُس کی نظمیں مع دیگر منظومات کے کتابی صورت میں شایع کی گئیں، جس پر نوجوان شاعر کو کچھ مالی امداد بھی ملی۔ سب سے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بادشاہ نے ان نظموں کو پسند فرما کر نوجوان شاعر کے لئے چالیس پونڈ سالانہ کا ایک وظیفہ مقرر کر دیا، یہ دیکھ کر کہ اب وہ اپنا گزارہ کر سکتا ہے وکٹر ہیوگو نے شادی کر لی۔ اُس کی بیوی کا نام ایڈیل فوشر تھا جو ہیوگو کے ایک ہمسائے کی لڑکی تھی، یہ لڑکی سانولے رنگ کی مگر خوبصورت و شکیل تھی۔

شادی کے بعد وکٹر ہیوگو نے اپنے قلم کو ذریعہ معاش بنا لیا، اب رومان، تمثیلیں، نظمیں اور گیت اُس کے دماغ سے ایک طوفان کی طرح بہ نکلے ۱۸۲۹ء میں (Les Orientales) شایع ہوئی جو اپنے انداز کی پہلی عظیم الشان تصنیف ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اُس کے اعلیٰ مرتبت شاعر ہونے میں کسی کو شک و شبہ نہیں رہا۔

اپنے ہمعصر شعرا و ادبا، یعنی گاٹیر، بالزک، رچاکراکس، میریمی اور ڈوما میں وہ نظرِ استحسان دیکھا جانے لگا۔ گاٹیر نے بیان کیا ہے کہ کس طرح [illegible] ملنے کی اجازت لے کر جھجکتا سا کمرے تک لرزتا ہوا، سیڑھیاں طے کر کے پہنچا اور کس طرح اُس نے ڈی کوئنس کی طرح (جو ورڈزورتھ سے [illegible] ملنے کا شائق تھا) دروازے کے قریب پہنچ کر تین بار واپس جانے کا تہیہ کیا اور آخر کار بڑی ہمت کے بعد اُس نے دروازہ پر دستک دی اور [illegible] ۔۔۔۔ اُس کا چہرہ زرد مگر متین اور آنکھیں تابناک تھیں اور پیشانی، گاٹیر بیان کرتا ہے "جسے دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا

کہ کسی سبز رنگ کا پھولوں کا تاج اُس کی زینت رہا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُن نظموں میں ایسی کیا چیز نہاں تھی جس نے گوتیر ایسے باکمال شاعر کو یہ سطور لکھنے پر مجبور کیا اور جس نے گوئٹے کی زبان سے ہیوگو کے متعلق تعریفی کلمات نکلوائے؟ اس سوال کے جواب میں ہم تھیوڈر دی بنویل کی چند سطور پیش کرتے ہیں جو خود ایک بہترین شاعر تھا۔

"جب وکٹر ہیوگو کے نئے افکار پردۂ ادب پر آتے ہیں تو ہر ایک چیز منور ہو جاتی ہے، گونجتی ہے، بولتی ہے، گاتی ہے، منور، متکلم و سحر آفرین اشعار اپنے رنگ، موسیقی اور تسلسل کی گوناگوں خوبیوں کے ساتھ، پر کیف و وجد آفرین رنگینیوں کا ایک مخزن معلوم ہوتے ہیں۔ اُسکے قلم کی ہر جنبش کتابِ شعریت میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے"

ان سطور میں مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا ہے، ہیوگو کی شاعری میں ہر ایک لفظ نیا ہے۔ زندگی اور رنگ کی حیثیت میں جدید خیالی دُنیا میں بالکل اچھوتا، غالباً ہیوگو کی اسی ناقابلِ تقلید فن کاری نے سوبرن ایسے شاعر سے یہ شعر کہلوائے تھے ؎

گر ہم، اے ہمارے آقا — ہم
جنکے دل تیری جانب مائل ہیں — ترے گیت کی یاد رکھتے ہیں

تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہیوگو کی فکری شاعری (Poetry of the [illegible]) ایک مغنیہ ہے جسکی آنکھوں میں تصویریں جھلکیاں لیتی ہیں ([illegible]) کا مطالعہ کرتے وقت قاری کے ذہن پر تصاویر کا ایک ہجوم چھا جاتا ہے گویا وہ کسی نگار خانے کی سیر کر رہا ہے۔

نظموں کے علاوہ جنکا ذکر اوپر کیا گیا ہے، وکٹر ہیوگو نے اُسی زمانے میں سیاسیات کی طرف توجہ کی اور نپولین اصغر "Napoleon le Petit" کے متعلق بہت سی ہجو یہ نظمیں کہیں، جن میں نپولین پر بڑے زور سے حملے کئے گئے ہیں یہ کتاب — (Les [illegible]) میں جسے ہم کتاب طنزیات کہہ سکتے ہیں۔ آتشیں نظموں سے پُر ہے جسے پڑھ کر قاری کے سامنے نپولین کی ایک بھیانک تصویر کھنچ جاتی ہے۔

نظموں، تمثیلوں، رومانوں اور گیتوں کے علاوہ جو ہیوگو کے سحر آفریں قلم سے وقتاً فوقتاً صفحۂ قرطاس پر تجلیاں بکھیرتے رہے اُس کی زندگی کے تین انقلاب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) ۱۸۴۱ء میں اُسے فرانسیسی اکیڈیمی کا ایک رکن منتخب کیا گیا۔ (۲) ۱۸۴۵ء میں اُسے فرانس کا ایک (Peer) بنایا گیا۔
(۳) ۱۸۵۱ء کی شورش میں اُسے پیرس سے جلا وطن کر دیا۔ اسکے علاوہ اُس کے سر کے لئے ایک خاص انعام بھی مقرر کیا گیا۔
ہیوگو نے جلا وطنی کے یہ ایام جرسی اور بعد ازاں گرنزی میں بسر کئے، جہاں پر اُسنے اپنی شہرۂ آفاق تصنیفات سپردِ قلم کیں جن میں [illegible] ([illegible]) اور [illegible] سب زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔
[illegible] میں ہم اُن واقعات کی زندہ تصاویر دیکھتے ہیں [illegible]

... مشابہ مناظر سے شروع کیا گیا ہے جو باغ عدن میں ایک جھیل کے کنارے اس دن کا خواب دیکھتے ہوئے دکھایا ... وجود کا تقدس ایک بچہ کی آمد پر زیادہ متوثر ہو جائیگا، یہ کہانی ایک دہشت ناک موقع پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے، جب اسرافیل ... صور لائے اُسے پھونکنے والا ہے۔

۱۸۲۷ء میں ہیوگو نے اپنا پہلا ڈرامہ (Cromwell) لکھا جو ادبی اعتبار سے بہت خوب ہے مگر موجودہ اسٹیج کے قابل نہیں ہے ۱۸۲۹ء میں اُسکی ٹریجڈی "میرین ڈی لیورن" مکمل ہوئی اور اس وجہ سے ضبط کر لی گئی کہ شاہی خاندان کے لئے یہ ناقابلِ برداشت ہے کہ کوئی بادشاہ اسٹیج پر اپنے وزیر کو کٹھ پتلی بنا ہوئے دیکھے، جب دوسرا بادشاہ تخت نشین ہوا تو اُس نے اس ٹریجڈی کی نمائش کی اجازت دیدی مگر ہیوگو نے چند وجوہ کی بنا پر اس ڈرامہ کو اسٹیج کے لئے نہیں دیا۔

۱۸۳۲ء میں اس کا دوسرا ڈرامہ (Le Roi s'amuse) شاہ لوئی فلپ کے حکم سے پہلی ہی نمائش کے بعد ضبط کر لیا گیا اور پچاس سال بعد اسی مہینے اور اُسی تاریخ کو جب وہ ضبط ہوا تھا بڑی شان سے اسٹیج پر آیا۔ اور متواتر کئی دن تک ہوتا رہا اس سے پہلے ظلم اور رحم کی متحرک تصاویر کبھی فرانس کے اسٹیج پر نہیں آئی تھیں، اس کے دوسرے سال بورجیا (Lucrèce Borgia) کی ٹریجڈی شائع ہوئی جسے ادب میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے

ہیوگو کا آخری ڈرامہ "لابر گریو" ایک دلکش منظوم ڈرامہ ہے جو بلند خیالی و نزاکت آفرینی کا مرقع ہے مگر اسٹیج پر آکر اس قدر ناکام رہا کہ مصنف تمثیل نگاری ہی سے کنارہ کش ہو گیا۔

ہیوگو کے ڈراموں میں بذلہ سنجی اور ظرافت کی چاشنی برائے نام موجود ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت کا رجحان اُسطرف نہ ہوا۔

جلاوطنی کے ایام میں ہیوگو نے بہت سی کتب تصنیف کیں جو صحیح معنوں میں اُس کا سرمایۂ زندگی ہیں۔

"نوترے دیم دی پیرس"

ہیوگو فرانسیسی اور پیرسی دونوں حیثیتوں میں ایک بڑا محب وطن تھا، نوترے دیم دی پیرس (Notre dame de Paris) میں اُس نے (... ... ...) کی زندگی کی قلمی تصاویر نہایت فن کاری سے کھینچی ہیں، اس داستان کا محور ازمنۂ وسطیٰ کا عظیم الشان گرجا ہے جو اُس وقت لوگوں کے خوابوں کا مرکز تھا اور اب بھی شہر کے لئے روح رواں ہے۔ یہ رومان (جسے وکٹر ہیوگو نے تیس سال سے کچھ کم عمر میں قلمبند کیا تھا) والٹر سکاٹ کے تتبع میں لکھا گیا ہے۔

کہانی کا خاص کردار قوسیمو ڈو ایک کبڑا ہے۔ جسکا جسم تو بہت بدشکل ہے مگر روح روشن ہے، قوسیمو ڈو کی گرجا سے ناقابلِ تسخیر محبت ہیوگو نے ان خوبصورت سطور میں بیان کی ہے۔

"وہ شاذ و نادر لوگوں کی دنیا کی طرف توجہ دیتا تھا۔ اُسکا گرجا اُس کے لئے کافی تھا جو مرمریں بتوں، بادشاہوں، پادریوں، اور درویشوں کی تصاویر سے آباد تھا۔ کم از کم یہ چیزیں اُسکا مضحکہ نہ اڑاتی تھیں، دوسرے بت جو دیووں اور مہیب صورت جنوں کے تھے۔ قوسیمو ڈو کو نفرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس لئے کہ وہ انہیں میں سے ایک تھا۔ دراصل وہ خود دوسرے لوگوں پر ہنسا کرتے تھے، درویش اس کے دوست تھے جو اس پر رحمت بھیجا کرتے تھے دیو اسکے دوست تھے جو اسکی حفاظت کیا کرتے تھے ... اُن سے طویل گفتگو کیا کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ ان بتوں میں سے کسی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے گھنٹوں گذار دیا کرتا ... موقع پر کوئی اور شخص آجاتا تو وہ کسی عاشق کی طرح جو اپنے محبوب کے ساتھ محو گفتگو ہو، وہاں سے بھاگ جاتا تھا۔

مگر اس محبوب عمارت میں وہ شے جس سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتا تھا جو اُسکی روح کو تاریکی سے بیدار کرتی تھی اور رقص کے بریدہ بازوؤں کو پھیلاتی تھی وہ قوت جو اُسے بعض اوقات حقیقی معنوں میں مسرت بخشتی تھی، گرجا گھر کے گجر تھے وہ انکی محبت میں گرفتار رہتا وہ اُن سے پیار کرتا تھا، اُن سے گفتگو کرتا اور اُن کی آواز کو اچھی طرح سمجھتا۔ گرجا گھر کے دو مینار اور گنبد مگر اس کے نزدیک عین بڑے پنجرے تھے جن میں اُس کے سکھائے ہوئے جانور صرف اسکے لئے نغمہ ریزی کرتے تھے۔ حالانکہ یہی گجر تھے جنکی بلند صدا نے اُسے بہرہ بنا دیا تھا۔ مگر مائیں اسی بچہ کو زیادہ پیار سے دیکھتی ہیں جس نے سب سے زیادہ دُکھ پہنچایا ہو۔ اس روز کی مسرت کو بیان کرنا بہت مشکل ہے جب تمام گجر ایک ساتھ بجائے جاتے تھے، جب اسے رخصت دیکر کہا جاتا ہو کہ "جاؤ"، تو وہ نیچے اترنے کی بجائے سیڑھیاں طے کرنا شروع کر دیتا، وہ ہانپتا ہوا اس کوٹھری میں پہنچ جاتا جہاں گجر معلق تھے وہ اس بڑے گجر کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا پھر نہایت شفقت سے اس سے باتیں کرتا اسے تھپکی دیتا جسطرح کوئی طویل مسافت طے کرنے کے بعد اپنے گھوڑے کو دیتا ہے۔

توسیمو ڈو اُن کے کھلے ہوئے جبڑوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا، گجر کی حرکت کیساتھ وہ بھی کبھی بلند ہوتا اور کبھی نیچے کی طرف دیکھتا جہاں لوگ چیونٹیوں کی طرح چل پھر رہے ہوتے کبھی اس بڑے گجر کی طرف نگاہیں اٹھاتا جسکی آواز ہر لمحے کے بعد اس کے کانوں میں گونجتی۔ یہی ایک ایسی صدا تھی جو وہ سن سکتا تھا۔ وہ صدا جو اس کے گرد و پیش کے دائمی سکوت کو توڑتی تھی۔ جب گھنٹہ گھر کانپتا وہ چلاتا اور اپنے دانتوں کو پیٹا، اس کے سُرخ بال کھڑے ہو جاتے، آنکھیں شعلہ فشاں ہو جاتیں، چھاتی دھونکنی کی طرح پھولتی اور سکڑتی۔ اور پھر نوترے دیم کے بڑے گجر اور توسیمو ڈو کی موجودگی ختم ہو جاتی وہ ایک خواب ہو جاتے، ایک ہوائی بگولہ ——— طوفان روح جو پردار گھوڑے کی ساتھ بندھی ہو، ایک نئی مخلوق، نصف انسان اور نصف گجر ——— !"

اس کہانی کا پلاٹ بذات خود بالکل خیالی ہے اور اسے کسی واقعہ سے کوئی نسبت نہیں، مگر یہ کتاب از منۂ وسطیٰ کی صحیح قلمی تصویر ہونے کے باعث دنیا کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

ہیوگو کی عدیم المثال رومان کا پیش منظر ([illegible])۔ بیسیوں کرداروں کی حرکت سے زندہ ہے، جن میں قابلِ ذکر اور ممتاز کردار یہ ہیں۔

کلاد فرولو، گرجا گھر کا (Archdeacon) جو شروع شروع میں نجوم اور دیگر علوم کا ایک خاموش طالبعلم ہوتا ہے مگر کچھ دیر کے بعد ایک رقاصہ ایسمریلڈا کے دام الفت میں گرفتار ہوتا ہے، یہ لڑکی جسے اُسنے اپنی ننھی سپید بکری کے ساتھ رقص کرتے دیکھا تھا ایک سحر آفریں تصویر ہے جو اندھیرے میں بجلی کے مانند کوند گئی۔ اس حسینہ کے عین برعکس ایک کردار (توسیمیو) ہے جو ایک آنکھ سے اندھا، کبڑا، بہرا، مکروہ صورت اور کسی پہلوان کے مانند تنومند ہے، ہیوگو کو یہ تضاد ([illegible]) بہت پسند تھا، توسیمیو کی بدصورتی کو جو گرجا گھر میں گجر بجانے پر ملازم تھا، ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"وہ ایک مہیب جن تھا ——— جن، جس کے اعضا منتشر ہونے پر پھر بہت بری طرح آپس میں جوڑ دئے گئے ہوں۔"

ان الفاظ سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہیوگو کا یہ بھیانک کردار کس شکل کا ہوگا۔ کلاد فرولو اُس کبڑے کو ایسمریلڈا کو اغوا کرنے کے لئے بھیجتا ہے مگر اس کی کوشش ناکام رہتی ہے۔ لڑکی کو عین موقع پر ایک فوجی محافظ [illegible] خوبصورت اور شکیل ہے جو ہر حسین لڑکی کو اپنا تختۂ مشق بنانے کا عادی ہے وہ ایسمریلڈا کو بھی [illegible]

[illegible] اسمیرلڈا بر پردست درازی کرنے کے الزام میں گرفتار ہو کر عدالت میں پیش کیا جاتا ہے، پھر اُسے زنجیروں میں جکڑ [illegible] جاتے ہیں، اس پر پتھر پھینکے جاتے ہیں، اُسکا تمسخر اڑایا جاتا ہے، غرضکہ طرح طرح کی تکالیف دی جاتی ہیں۔ اس موقع پر اسمیرلڈا ہجوم کو چیرتی ہوئی بڑھتی ہے اور اس بدنصیب و واژگوں بخت کبڑے کو پانی کا ایک پیالہ پیش کرتی ہے جس پر وہ دل و جان سے اسکا غلام بن جاتا ہے۔

فوجی محافظ اپنے کردہ ارادہ میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتے ہوئے اسمیرلڈا سے ایک جگہ ملنے کا وقت مقرر کرتا ہے مگر پادری فرولو اس کا تعاقب کرتا ہے دونوں کی مڈھ بھیڑ ہو جاتی ہے اور پادری فوجی محافظ کو ہلاک کر کے تاریکی میں روپوش ہو جاتا ہے۔

اسمیرلڈا و اِس قتل کے الزام میں گرفتار کر لی جاتی ہے اور اس پر جادوگری کا ایک اور الزام عائد کرنے کے بعد اُسے جلاد کے حوالے کر دیا جاتا ہے مگر کوسی مودو تماشائیوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا بڑھتا ہے اور لوگوں کا مقابلہ کرتا ہوا گرتا پڑتا اُسے گود میں اُٹھا کر وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔ یہ منظر اس قدر زبردست قوت سے پیش کیا گیا ہے کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

پھانسی کے چبوترے سے اٹھا کر کبڑا لڑکی کو گرجا گھر کی قربانگاہ میں لے آتا ہے جہاں سے پادری اسمیرلڈا کو ایک خفیہ راستے سے پھر پھانسی کی طرف لیجاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ موت اور شادی میں سے کوئی ایک چیز منتخب کر لے۔ لڑکی چلا کر شادی سے انکار کر دیتی ہے اور پھانسی کو ترجیح دیتی ہے۔ اس پر پادری اسے جلاد کے حوالے کر دیتا ہے۔ اسکے بعد ہیوگو کے قلم نے اپنی داستان کے آخری منظر کو اس روانی، زور اور فن کاری سے بیان کیا ہے کہ طبیعت میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے اور اس باب کا ایک ایک لفظ آتشیں شعلے کی مانند آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتا ہے۔

اس داستان کے علاوہ ہیوگو کی کوئی اور تصنیف اُسکی خداداد قوتِ تصنیف کو زیادہ واضح طور پر ظاہر نہیں کر سکتی — اولاً زبردست قوتِ فکر کا عطیہ، ثانیاً تفصیلات کو کمال احتیاط سے قلمبند کرنے کا فن۔

انگریزی انشاپرداز ([illegible]) ڈکنز کو موخرالذکر فن کا بہترین امام تسلیم کیا جاتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ بھی ہیوگو کی ناقابلِ نقل صنعت کا مدِ مقابل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

مصیبت زدہ

اب ہم ہیوگو کے دوسری شہرہ آفاق رومان "مصیبت زدہ" ([illegible]) کے متعلق کچھ بیان کرتے ہیں۔

"مصیبت زدہ" ۱۸۶۲ء یعنی ہیوگو کے سیاسیات میں حصہ لینے کے تیس سال بعد شائع ہوئی۔ یہ امر ایک حد تک بہت تعجب خیز اور دلچسپ ہے کہ عمر کے اس حصہ میں جب کہ ہیوگو زندگی کے کئی سال مختلف سرگرمیوں میں بسر کر چکا تھا۔ وہ جذبۂ ہمدردی اور رومان کا ایک مشترکہ شاہکار لکھ سکا۔

اس داستان میں ہیوگو کے قلم نے زندگی کے سب سے نازک و اہم پہلو کو منتخب کرتے ہوئے جذبات نگاری، ڈرامائی قوت اور تجزیۂ نفسی کی قدرت کو یکجائی طور پر تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات پر پھیلا دیا ہے۔

"مصیبت زدہ" میں حیاتِ انسانی کے اہم ترین مسئلوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ کہانی کا لفظ لفظ جذبۂ ہمدردی میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایک ایک سطر میں غرباء کی تکالیف [illegible]

ین تصویر پیش کرتا ہے جس سے ہم بالکل غافل تھے۔

ہیوگو کا یہ شاہکار درحقیقت ایک گجر کی خوفناک صدا ہے جو ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کرکے حیاتِ انسانی کی ایک ایسی ریک تصویر دکھاتا ہے کہ روح کانپ اٹھتی ہے، بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ غربت کا بھیانک دیو اقعی ہمارے سامنے بیکس لوگوں کو ایک بڑے تنور میں ڈھکیل رہا ہے۔

ہم آنکھوں کے سامنے ایک معصوم لڑکی کو دیکھتے ہیں جو دُنیا سے بالکل بے خبر ہوتی ہے۔ پھر ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک نوجوان ظاہر ہوتا ہے جو اس بھولی لڑکی کو اپنے دامِ الفت میں گرفتار کرنے کے بعد اُس کے دامنِ عصمت کو چاک کر دیتا ہے۔ لڑکی شرم کے رے اپنی نوزائیدہ بچی کو لے کر بھاگ جاتی ہے اور اسے ایک شرابخانے کے مالک کے حوالے کرکے ایک دوسرے شہر میں کارخانے یں کام کرنے لگتی ہے۔ وہ خوش ہے کہ آخر وہ کسی پر بوجھ نہیں ہے مگر فلک کو یہ مسرت منظور نہیں ہوتی، شرابخانے کا مالک اُس تیرہ بخت لڑکی سے طرح طرح کے بہانے تراش کر روپیہ وصول کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنی بچی سے بہت دُور ہے مگر مرف اس امید پر جی رہی ہے کہ کسی روز اُس کے پاس جا کر اسے لے آئیگی۔ ایک روز اس لڑکی کو شرابخانے کے مالک کی طرف سے اطلاع ملتی ہے کہ اسکی لڑکی بیمار ہے۔ اس لئے اس کے لئے کافی روپیہ کی ضرورت ہے، وہ سوچتی ہے کہ روپیہ کہاں سے لائے آخر اپنے بال ——— وہ سنہری بال جن پر اسے ناز تھا حجام کی نذر کر دیتی ہے۔ اب وہ مسرور ہے کہ آخر اُس نے اپنی لڑکی کو بچا لیا، پھر خط آتا ہے کہ اسکی لڑکی ہنوز بیمار ہے اور مالی امداد کی سخت ضرورت ہے۔ وہ اپنے دانت اکھڑوا کر بیچ دیتی ہے ——— کہانی کا یہ منظر اسقدر دردناک ہے کہ آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ قلم کی ہر جنبش سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک سچی تصویر دیکھ رہے ہیں ——— یہ کامیابی شاید ہی کسی مصور کو نصیب ہوئی ہو۔

پھر ہم اس لڑکی کو کارخانے سے نکلتا دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ لوگوں کو شک ہے کہ وہ بدکردار عورت ہے ——— اب کیا ہوتا ہے یہ ایسا موقع ہے کہ دل ہل جاتا ہے۔ ہم یہاں ہیوگو ہی کے الفاظ نقل کرتے ہیں۔

" خدایا! لوگ اُس سے کیا چاہتے تھے؟ اس نے محسوس کیا ایک وحشی حیوان اس کے سینے میں کروٹیں لے رہا ہے۔ اُسکے ساتھ ہی اُسے تھینارڈیر (شراب خانہ کا مالک) کا خط موصول ہوا تھا کہ اگر وہ اپنی لڑکی کو ذیت کے لئے ایک سو فرانک روانہ نہ کریگی تو وہ اس بے پناہ سردی میں گھر سے باہر نکال دی جائیگی۔

"سو فرانک" فینٹائن نے خیال کیا! مگر وہ کون سی جگہ ہے جہاں سے یہ رقم مہیا کی جا سکتی ہے"

" خیر" اس نے دل میں ارادہ کر لیا" میں اپنا باقی ماندہ اسباب فروخت کر دوں گی" ——— بدنصیب لڑکی ایوانِ گناہ کے ایک دریچے میں بیٹھ گئی"

"جطرح" نوترے دیم دی پیرس" ازمنۂ وسطیٰ کا ایک رومان تھا ٹھیک اُسی طرح "مصیبت زدہ" ازمنۂ حاضر کی ایک دردناک داستان ہے۔ کہانی کے بیشتر کردار جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، طبقۂ ادنیٰ میں سے ہیں۔

یہ کتاب لکھتے وقت ہیوگو کے پیشِ نظر دو امور تھے اوّلاً انفرادی بہبودی ثانیاً منظم مجلسی دائرہ کا استبداد ——— غالباً

[illegible] کرنے کے لئے اپنی قلم کو جنبش دی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُس کے ان افکار کا فرانس پر بہت اثر ہوا۔
[illegible] اس داستان کا ہیرو ایک مجرم، ژین ولژین ہے جو جیل سے رہا ہو کر ایک پادری کے یہاں پناہ گزیں ہوتا ہے جو انکی بڑے خلوص سے تواضع کرتا ہے مگر یہ مجرم اس پادری کے چاندی کے برتن چرا لیجاتا ہے اور پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو کر پھر پادری کے روبرو پیش ہوتا ہے جو اسے یہ کہہ کر رہا کرا دیتا ہے کہ وہ برتن خود اُسنے اُسے تحفے کے طور پر دئے ہیں۔

کہانی کا یہ باب بذاتِ خود ایک مکمل و کامیاب افسانہ ہے جو کئی مرتبہ اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اکثر نہایت کامیابی سے یورپ کے اسٹیجوں پر ایک تمثیل کی صورت میں کھیلا جا چکا ہے۔ جن حضرات نے "ابن ساباط" کا واقعہ مولانا ابوالکلام کے موقر جریدہ "الہلال" میں پڑھا ہے وہ "ابن ساباط" اور ژین ولژین دونوں کو معاشری و مجلسی عیوب کا شکار پائیں گے۔ حالانکہ اخلاقی طور پر دونوں دنیا کے بہترین انسان بنائے جا سکتے تھے۔ وکٹر ہیوگو کا پادری اور "ابنِ ساباط" کا جنید بغدادی بلحاظ کردار یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ ہیوگو کا پادری محض نتیجۂ فکر ہے اور شیخ جنید بغدادی کو انسانی تاریخ ہرگز فراموش نہیں کر سکتی۔ خیر! یہ ایک جملۂ معترضہ تھا ۔۔۔ باقی کتاب کے تمام اوراق اسی قسم کے تمثیلی واقعات ہیجان سے لبریز ہیں۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں مجرم کو پادری رہا کرا دیتا ہے، اس موقع پر مجرم کی کتابِ حیات کا سیاہ ترین ورق اُلٹ جاتا ہے ۔۔۔ اب اسکے بدن میں ایک نئی زندگی حلول کر جاتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد ہم اسی عادی ملزم کو ایک کارخانے کا مالک دیکھتے ہیں ۔۔۔ وہ اس عرصے میں اپنی تاریک عادات چھوڑ کر شہر کا ممتاز انسان بنا ہوتا ہے۔ گو لوگ اُسے نیک و رحدل موسیو میڈلین کے نام سے جانتے ہیں۔ مگر خفیہ پولیس کا ایک جاسوس جیورٹ اسکے مکان پر آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ اس سے کچھ عرصہ پہلے اُسے شک تھا کہ وہ ژین ولژین نامی ایک عادی مجرم ہے مگر اب یہ شک رفع ہو چکا ہے جب کہ فلاں عدالت میں وہی شخص گرفتار ہو چکا ہے اور عنقریب اس پر مقدمہ چلایا جانے والا ہے۔ یہ سُن کر ولژین کے دماغ کی عجیب حالت ہوتی ہے کبھی وہ خیال کرتا ہے کہ چلو مجھ پر اب کوئی شک نہ کریگا میرے نام سے ایک اور شخص گرفتار ہو چکا ہے اور یقینی طور پر اُسے سزا ملجائیگی میں آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرونگا۔ مگر اب شیطانی خیالات کی بجائے اسکا ضمیر بیدار ہو کر اُسے ملامت کرتا ہے اور تہیہ کر لیتا ہے کہ عدالت میں جا کر اپنے آپ کو پیش کر کے وہ اس بیگناہ انسان کو بچا لیگا۔ غرضکہ تمام رات اسکے دماغ میں مختلف خیالات کی تند لہریں ٹکراتی رہتی ہیں۔ ہیوگو نے اس مجرم کے دماغ کو ایک میدان دکھایا ہے جس میں نیکی اور بدی ایک عرصہ تک سرگرم پیکار رہتی ہیں۔

داستان کے صرف اس حصے کو پڑھنے کے بعد جسمیں اسنے ولژین کے دماغی طوفان کو قلمبند کیا ہے اسکی غیر معمولی قوتِ تجزیۂ نفسی عیاں ہو جاتی ہے جن اصحاب نے اس داستان کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ اس ٹکڑے کی ادبی قدر و قیمت بخوبی سمجھتے ہونگے۔ یورپ میں بہت سے انشاپردازوں نے ہیوگو کے اس فن کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے مگر بے سود ۔۔۔ ہیوگو کا یہ فن ناقابلِ تقلید ہے۔

اب ہم پھر کہانی کے پلاٹ کی طرف چلتے ہیں ۔۔۔ آخر ضمیر کی صدا غالب آ جاتی ہے اور ولژین عدالت میں پہنچ کر جہاں پر ایک بیگناہ انسان کو عمر قید کی سزا دی جانیوالی ہوتی ہے بانگِ دہل اعلان کر دیتا ہے کہ جسے لوگ موسیو میڈلین کے نام سے جانتے ہیں درحقیقت ژین ولژین نامی عادی مجرم ہے نہ کہ وہ جسے عدالت نے غلطی سے گرفتار کر رکھا ہے ۔۔۔ اس طرح وہ اپنی محنت سے حاصل کی

بانتظر ہے جسے الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ عدالت ولجین کو عمر قید کی سزا دے دیتی ہے۔ مگر وہ ایک دفعہ پھر سمندر میں کود کر بھاگ نکلتا
رہ ہے گر لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ ڈوب کر مرگیا۔
ب وہ فنتائن (جسکے متعلق ہم شاید اوپر لکھ چکے ہیں) کی لڑکی کوزیت کو شرابخانے کے مالک تھیناردئیر سے بہت سا روپیہ ادا کرنے پر
ساتھ لے آتا ہے۔ یہ منظر جب وہ شرابخانے میں جاکر ننھی کوزیت کو شفقت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور اس کو ہر ممکن طریق پر خوش
کی کوشش کرتا ہے اس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ آج تک کوئی ایسا مصور جو بچوں کو چاہنے
یہ ایسی زندہ اور پیاری تصویر کھینچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ہیوگو کی اپنی کتاب (The art of being a grandfather
دلکش منظر سے خالی ہے۔
عرصے تک ولجین لوگوں کی نگاہوں سے دور رہتا ہے مگر آخرکار جیورٹ نامی سراغرساں اُسے دیکھ لیتا ہے اور اُسکا تعاقب کرنا
ع کر دیتا ہے۔ جیورٹ کی نظروں سے بچکر ولجین ننھی کوزیت کو ساتھ لئے ایک دیوار پھاند کر باغ میں کود پڑتا ہے۔ اس باغ کا بوڑھا
اشیلونیت اپنے محسن کو فوراً پہچان لیتا ہے (ولجین نے جبکہ وہ موسیو میڈلین کے نام سے زندگی بسر کر رہا تھا اس بوڑھے کو گاڑی
نیچے سے کھینچ کر بچایا تھا) یہ بوڑھا ولجین کی ہر طرح خدمت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے قصہ مختصر ولجین اس باغ میں جو ایک (Convent)
کا ملحق تھا نوکر ہو جاتا ہے اور کوزیت کو (Convent) کی راہبہ لڑکیوں کے حوالے کر دیتا ہے جو اُسکی تعلیم و تربیت کا ذمہ لے لیتی ہیں۔
اب بظاہر ان کی زندگی نہایت آرام دہ و سکون بخش ہوتی ہے مگر فلک کج رفتار کو یہ منظور نہیں ہوتا ــــ ولجین ایک دفعہ پولیس کے
ں گرفتار ہوتے ہوتے بچتا ہے۔ اور وہاں سے بھاگ کر پیرس کی زمین دوز موریوں (Sewers) میں پناہ گزیں ہوتا ہے۔
کہانی کا یہ حصہ جس میں ہیوگو نے ولجین کو ان غلیظ موریوں میں گرتا پڑتا پناہ لیتا ہوا دکھایا ہے مصور تحریر (   )
ترین ولاثانی شاہکار ہے۔
داستان کے آخری حصے میں کوزیت جو اب ننھی بچی سے جوان لڑکی میں تبدیل ہو چکی ہوتی ہے۔ ایک نوجوان لڑکے میریس سے شادی
ی ہے اور ولجین اس مسرت کے درمیان دنیا سے سفر کر جاتا ہے ــــ ایک عظیم الشان تصنیف کا حسین انجام۔
ہیوگو کی دیگر تصانیف میں (Toilers of the sea) بھی ایک بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں ہیوگو نے ایک نئے مسئلے پر ایک
ب داستان قلمبند کی ہے جس کا انداز تحریر باقی کتابوں کی طرح پرجوش ہے۔
ان کتابوں کے علاوہ جنکا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں، ہیوگو کی چند کتابیں اور بھی ہیں۔ جن پر فرداً فرداً تبصرہ کرنا بجائے خود ایک طویل مضمون
تاج ہے۔ اس کے علاوہ ہم اس صحبت میں ہیوگو کے ڈراموں کے متعلق تفصیل سے کچھ نہیں لکھ سکتے۔ اگر موقع ملا تو ان تمثیلوں پر اجمالی
رہ کی صورت میں ایک علیحدہ مضمون لکھا جائے گا۔ دیگر ناول جن کا ذکر اس مقالے میں نہیں آیا وہ یہ ہیں۔

(1) Bug Jargal (2) Laughing man or Bynder of Keki...
(3) History of a crime (4) Han of Iceland (5) ...
...ee

(History of a crime) میں وہ واقعات درج ہیں جو اُس زمانے میں وقوع پذیر ہوئے تھے جب ہیوگو نپولین کے
ات مخالفت لہرا رہا تھا۔ دراصل یہ کتاب ایک روزنامچہ ہے۔ جو ہیوگو ان سرگرم ایام میں روشنائی ابتدائی کی صورت میں لکھتا

…ی صورت میں مرتب کرکے شائع کر دیا۔
[illegible]) ادبی لحاظ سے ہیوگو کی مشہور تصانیف میں شمار نہیں ہوتی۔ یہ کتاب جیسا کہ اسکے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے ہیوگو … صرف چودہ دن میں لکھی تھی۔ جبکہ وہ کسی شخص سے شرط کر چکا تھا کہ وہ ایک کتاب صرف قلیل عرصہ میں تیار کر سکتا ہے

[illegible]) ہیوگو کی شاہکار تصنیف ہے اس کتاب میں امرا و پادشاہوں کے عجیب مشاغل کا نہایت فن کاری سے تذکرہ …یا ہے جو اپنی دلچسپی کی خاطر ننھے بچوں کے چہروں پر عمل جراحی کر انکے بعد انہیں بدشکل بنا کر اپنے پاس رکھا کرتے تھے اس المیہ داستان میں …ایسے شخص کا ذکر کیا ہے۔ جس کا چہرہ بادشاہ کے حکم سے بگاڑ دیا جاتا ہے —— اُس کے چہرے پر ایسے خوفناک طریقے سے عمل جراحی کیا جاتا ہے کہ وہ قہقہہ دائمی طور پر اُس کا جزو بن جاتا ہے جو بعد ازاں سوسائٹی کے لئے ایک دلچسپی کا سامان مہیا کرتا ہے

اس ہمیشہ ہنسنے والے شخص کے علاوہ داستان میں ایک اور حزنیہ کردار ہے —— یہ کہانی کی ہیروئن یعنی ایک اندھی لڑکی ہے جسے …زن دو سال کی عمر میں، اپنی غربت زدہ ماں کی چھاتی کے ساتھ لپٹا ہوا، اندھیری رات میں برف تلے دبا ہوا پاتا ہے —— یہ باب …ں میں ہیوگو نے برفباری، تاریک رات، لہروں کا شور اور لڑکی کو اپنی مردہ ماں کے ساتھ برف میں دبا ہوا دکھایا ہے۔ اس قدر زندہ نقوش …رئیے ہیں کہ کسی عکسی تصویر کی حاجت نہیں رہتی اور پھر اس قلمی تصویر کے تکمیلی نقوش اپنے اندر سحر کی قوت رکھتے ہیں —— اور اس بے جان عورت کے پستان کے منہ پر دودھ کا ایک قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ دسمبر کی سردی نے ننھے بچے کو اس آخری اثاثے سے بھی محروم کر دیا تھا۔

شاید ہی کوئی ایسا سنگدل انسان ہو جو اس دردناک داستان کو اپنی آنکھیں اشک آلود کئے بغیر پڑھ سکے۔ اس کتاب میں بھی ہیوگو نے جلسی رائے کو مطعون و ملعون قرار دیا ہے۔

بہر حال ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہیوگو اپنے وقت کا بہترین شاعر، مفکر، انشا پرداز تھا —— ہم اُسے سیاست داں ماننے کو یکسر منکر ہیں مگر اُس نے اکثر اوقات اپنی تصانیف و مقالات میں اپنے آپ کو اس اہلیت کا بھی مالک بنانا چاہا ہے۔

سعادت حسین منٹو

یوپی میں اردو

(مسلسل)

ید- مفتی ابو سعید بن مفتی علیم اللہ بن مفتی عبید اللہ بن مفتی شیخ عیسیٰ صوفی محدث گوپاموی علہ
آخر عہد عالمگیری میں ولادت ہوئی علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل پدر بزرگوار سے کی۔ برادر کلاں شیخ عیسیٰ ثانی منجانب
رنگ زیب محتسب اجین و منصب دار سہ صدی تھے۔ حضرت سعید بعد تحصیل علمی مفتی کے عہدہ پر ممتاز ہوئے[1] علم و فضل
کے ساتھ شاعرانہ ذوق بھی تھا۔ فارسی میں فکر سخن کرتے ہوئے ہندی میں بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ آپ کا ایک مجموعہ کلام فارسی
ہندی موجود ہے۔ ایک مثنوی بحر حقائق بھی یادگار سے ہے۔ حاشیہ مرات العالم پر آپ کے حال میں یہ تحریر ہے۔

در نظم و نثر طرز جدید دارد و جمیع اصناف و اقسام فنون از علمائے عصر
ممتاز بودہ۔

۱۱۴۷ھ میں وفات پائی۔

دو دیات کی روپ سون سدا رہیو بھائے — کتا چوک چڑھائے جا کے جاتن جائے
نگر کے کارن من پچھتائے — سخن کے چوٹ جلا ہا کھائے
سدا راہیہ پاسکی سدہ بدہ گئے ہرائے — یہی ریت ہر پیت کی سدہ آئے سدہ جائے
جیسے نگری تیسی ریت — اندھی ملا بھوتے میت[3]

مولوی عبد الرب شرفائے اکبر آباد سے تھے۔ ریاضی میں کمال حاصل تھا۔ علوم عربی۔ فارسی کے علاوہ
[انگ]ریزی بھی جانتے تھے۔ دہلی میں ۱۱۴۲ھ میں محمد شاہ کے حکم سے مہاراجہ سوائی جے سنگھ والی جے پور نے عظیم الشان
رصد کی تعمیر شروع کی علمائے مہندسین کی جماعت قایم ہوئی۔ مرزا خیر اللہ مہندس میر جماعت تھے اسی وقت میں
مولوی عبد الرب بھی بغرض ملازمت دہلی گئے۔ وہ بھی رصد خانہ میں ملازم ہو گئے اور ان کو بھی جماعت مذکورہ میں
شرکت کرنا پڑی۔ اس کے علاوہ اور بھی صاحب کمال لوگ اس مجلس میں شریک تھے۔ فن ہیئت و ہندسہ و

[1] تذکرۃ الانساب مولوی مصطفےٰ علیخاں گوپاموی [2] تاریخ خاندان مفتیان گوپامئو [3] قلمی بیاض (مجموعہ کلام ہندی) ملک کتب خانہ
مفتیان گوپامئو

...ترجمہ ہوئیں شرح چغمنی کا ترجمہ ہندی میں کیا گیا اور مشربین کی کتاب مساحت کا انگریزی سے ... مصنفانہ کی امانت سے مولوی عبدالرب نے اردو میں ترجمہ کیا اس کے علاوہ ایک علم ہندسہ کی ... بھی مرتب کی۔ مولوی صاحب مراجعت وطن پر رسالہ مساحت کو اپنے ہمراہ لے آئے تھے۔ اہلِ خاندان سے ڈپٹی ... اد علی مرحوم کے کتب خانہ میں یہ نسخہ آیا آج کل میرے ایک دوست کی ملک ہے۔ مترجم کی تاریخ وفات کا علم نہ ہو سکا

نمونۂ عبارت رسالہ مساحت

سپاس بے زبان کی برستایش خداوند قدیر کی ہے کہ گلستانِ مرحمت اس کی برستی دامن فلک کا گلہائے کواکب سے پُر ہوا اور شادابی بوستاں کی بابیاری رب العالمین کی ہے کہ نسبت نخل بندیٔ صفت اس کی سبزہ زارِ سپہر اخضر سے شفق پھولی و در بیان بنائے نامتناہی کے زبان ناطقہ لال و خامہ در میان اوصاف کمالات بزبان حال ۔ ما عرفناک حق معرفتک

درود نا محمود رسول مقبول کہ بر عالم افروز دینِ متین و شرح مبین در چراغ ہدایت .....

کہ گوہر شب چراغ ایماں کو بحر زخار خطا سے نکال کر چراغ راہِ سالکان مسالک خدا شناسی کا کیا وجی امام مقتدائے کافہ انام آفتاب شہرت کہ وقوع کسوفات محق و مصائب سے اندیشہ نہ کرکے پر توضیا ر ایمان و یقین

. . . .

عبد ذلیل معتصم رب جلیل عبدالرب نے یہ رسالہ زبان اردو میں ترتیب دیا۔ اور تصحیح اس کی صاحب عالیشان مہتمم رصد خانہ سلطانی نے کی۔ بہ عہد عدالت مہد . . . . . . بادشاہ والاجاہ کیواں بارگاہ خورشید کلاہ . . . . . . ابوالفتح معین الدین سلطان زماں محمد علی شاہ بادشاہ غازی

یہ رسالہ بیچ بیان مساحت کے ہے کہ ترجمہ کیا ہے۔ جو انگریزی سے زبان اردو میں جسمیں کو آسان ہو۔ مصنف اس کا حکیم بین صاحب ہے۔

محمد حسین کلیم دہلوی نظم ونثر دونوں میں قدرت تھی۔ میر محمد تقی میر سے قربت قریبہ تھی۔ میر حسن دہلوی کے بیان سے معلوم ہے کہ فصوص الحکم کا اردو ترجمہ کیا۔ عروض و قافیہ میں بھی ایک رسالہ لکھا۔ اسی طرح اردو نثر میں دو کتابیں اور ایک مثنوی[1] لکھی۔ صاحبِ دیوان[1] ہیں۔

در ہندی نثر کتابے نیز ایجاد کردہ[2]

یہ کتاب احمد شاہ کے نابینا کے جانے کے بعد لکھی گئی ہے۔ جس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے۔

کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر آج کے دن بیٹھے ہیں اندھے ہو بصیر ایسی دولت سے زنہار زنہار۔

فاعتبروا یا اولی الابصار[2]

درازی شب ہجراں زلف یار کلیم ۔۔۔۔۔ نہ مجھ سے پوچھ کہ کاٹی ہے رات آنکھوں میں

مولوی غلام امام بن محمد ولی اللہ ابن محمد علی گوپاموی۔ نواسہ شیخ خیر الدین بن شیخ خیر اللہ بن شیخ عبد الوالی العمری۔

غلام امام کا ننہال علم و فضل کا گھرانہ تھا۔ جس میں مولوی مصطفٰے علیخاں صاحب۔ تذکرۃ الانساب متوفی ۱۰۹۸ھ بنی عم نواب محمد علی والاجاہ اور قاضی مجتبیٰ علیخاں۔ خوشدل قاضی القضات مدراس سے لوگ پیدا ہوئے۔ پیدایش ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ مفتی محمد ولی۔ شیخ غلام محمد محدث مولوی وہاج الدین قاضی حکیم علی بن قاضی مبارک شارح سلم سے اساتذۂ وقت سے علوم و فنون کی تحصیل کی۔ شعر و شاعری سے دل لگاؤ تھا۔ مشورہ سخن فیض احمد سے لیا۔ آخر عمر میں نواب شجاع الدولہ کے یہاں چلے آئے۔ ان کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے۔ ان کی سواری کے جلوس کے حالات کو اردو میں مثنوی سحر معنیٰ کے نام سے لکھا۔ یہ مثنوی انکی یادگار سے ہے۔ ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا[3]

آغاز مثنوی

الٰہی پردۂ صورت اٹھا دے ۔۔۔۔۔ جمالِ شاہد معنیٰ دکھا دے

پریشاں خاطری سے ہوں میں غافل ۔۔۔۔۔ عطا کر مایۂ جمعیتِ دل

کٹی غفلت میں میری عمر ہے ۔۔۔۔۔ ترا فضل و کرم درکار ہے اب

[1] گل رعنا از مولانا حکیم عبد الحیٔ لکھنوی [2] تذکرہ میر حسن دہلوی [3] مواقیت الفواتح۔ مرتبہ قاضی [illegible] شدا متوفی ۱۲۳۴ھ

...الی بن پی ... رب ...

... فاضل ہی ... | صرف الطرفی ... و ہو
... بھی قول و فعل اپنا نبھایا | فآ ہا تم آہا تم آہا
رہائی دے مجھے دنیا کے غم سے | بہت عاجز ہوا ہوں اس الم سے[1]

... حکیم محمد شریف خاں ابن حاذق الملک حکیم محمد اکمل خاں ابن حکیم محمد واصل خاں نبیرہ ملا علی داؤد برا... ...ی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے اجداد میں سے ایک بزرگ بابر کے ہمراہ وارد ہند ہوئے۔ حیدر آباد میں طرح اقامت ... محمد واصل خاں اور حکیم محمد فاضل خاں آگرہ آئے اور سکونت پزیر ہوگئے۔ حکیم محمد واصل خاں علم و فضل میں یگانہ ... اور فن طب میں بھی کمال رکھتے تھے۔ شاہ اورنگ زیب نے طبیب دربار کے عہدہ پر ممتاز کیا۔ حکیم صاحب شاہ ... اللہ کے خلیفہ بھی تھے۔ ان کے خلف حکیم محمد اکمل خاں ہیں۔ طبیب حاذق تھے جو محمد شاہ کے طبیب خاص تھے۔ ...شاہ نے سواد عظیم آباد میں دو لاکھ کی جاگیر عطا کی اور حاذق الملک کے خطاب سے اعزاز بخشا۔

حکیم شریف خاں ۱۱۳۰ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ بدو شعور پر علوم عقلیات و نقلیات کی تحصیل اپنے والد ماجد ...ی کی علمائے متجرین سے تھے فن طب میں ثانی بوعلی سینا کہے جاتے تھے۔ شاہ عالم کے وقت میں شاہی طبیب تھے ...شرف الملک خطاب تھا پانی پت و مضافات دہلی میں ۲۵ ہزار کی جاگیر بادشاہ کی طرف سے عطا تھی۔ علم و فضل کے ... تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ ۱۱۹۳ھ میں فارسی میں مشکوٰۃ کا ترجمہ کاشف المشکات کے نام سے کیا۔ ...شیہ نفیسی۔ حاشیہ شرح اسباب۔ آثار نبوت۔ شرح حمد اللہ اس کے علاوہ اور بھی رسائل آپ کی یادگار سے ہیں ...نامہ آپ کا قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے گو فارسی میں بھی ترجمہ کیا ہے مگر اردو ترجمہ بہت صاف ہے۔ اور شاہ ...اللہ سے تقریباً بیس برس پہلے کا ہے۔ یہ ترجمہ مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسیح الملک علامہ حکیم محمد احمد خاں صاحب ... پاس موجود ہے۔ جس کے مطالعہ سے مشرف ہوا ہوں۔ حکیم شریف خاں نے ۱۲۲۲ھ میں انتقال کیا۔ نمونہ یہ ہے

سورۂ فاتحہ کی ابتدائی آیات کا ترجمہ

جو تعریف کہ اوّل سے آخر تلک موجود ہے لایق ہے واسطے اللہ کے کہ پالنے والا ہے
تمام عالموں کا بخشنے والا وجود کا آخرت میں ...[2]

...خان بن فخر الدین محمد مشاہیر اہل قلم سے تھے۔ عہد عالمگیر میں تحفۃ الہند کتاب لکھی۔ مرزا خان کو ہند ... فن موسیقی سے عشق تھا وہ ہندی (برج بھاکا) کو ہندوستان کی زبانوں میں ...

...ہیں ... ہے۔ [2] ... اس ترجمہ کی طباعت کا انتظام کیا ...

دنیا کے عجائبات میں [illegible]

بنگال کے جادو، ڈاکر اور آسام کے واقعات، نیپال اور تبت کی ترائی [illegible]
جو طلسم سے زیادہ حیرتناک جادو سے زیادہ موثر اور مسمریزم سے کہیں زیادہ [illegible] [illegible]
ہوا اسکو شہرت حاصل ہے۔ یہ ایک کتاب ہے۔ جسکا نام [illegible]

خوفناک جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے والے مہاتماؤں سادھوؤں

اور کامل فقیروں سے حاصل کئے ہوئے ایسے ایسے گرانقدر جادو اثر اور سو فیصدی کامیاب ہو نیوالے [illegible]
کو بھی زندہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کو آئے دن شایع ہو نیوالی کتابوں کی طرح نہ سمجھئے نہ ایسی کوئی [illegible]
گیا ہے وہ مصنف کے چشم دید واقعات ہیں۔ جنکی سچائی کندن کی طرح روشن ہے۔

بنگال کے جادو اور نیپال کی ترائی کے حیرتناک طلسم

جو مصنف نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اور جنہیں پڑھنے کے بعد نہ صرف آپ حیران ہوں گے بلکہ اپنی زندگی میں [illegible]
صداقت کے ساتھ اس کتاب میں درج کئے گئے ہیں۔

ایک مہاتما کی پیچیدہ تحریر

جسے وہ جنگل میں بھول گئے تھے اور خوش قسمتی سے اس کتاب کے مصنف کو مل گئی اس کا ترجمہ مع اصل کے پایا گیا۔ وہ تحریریں [illegible]
معلوم کرنے کے لئے بڑے بڑے علماء حضرات کو غور کرنا پڑا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر کار اس کا مطلب [illegible]
صاحب دنیا کی تمام زبانوں کے ماہر اور قابل تسلیم [illegible] [illegible] دماغ سوزی کے بعد [illegible]

ہزاروں انسانوں کو زندگی دینے والی

اور انہیں موت کے پنجے سے نجات دلانے والی یہ پہلی کتاب ہے جو نامرد کو مرد، بوڑھوں کو نوجوان [illegible]
عشرت سے ہمکنار کرتی ہے۔ یہ کتاب نہیں کرامات کا ایک خزانہ ہے جو آج سینکڑوں [illegible] کے اصرار کر کے [illegible]
قیمتی اور انمول ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آج تک ایسی کتاب آپ نے نہیں دیکھی ہوگی [illegible]

پسند نہ ہو تو تین دن کے اندر واپس کر سکتے ہیں

اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اگر آپ دولت، عزت، شہرت، اور عیش و آرام کے [illegible] ہیں تو اس کتاب کو [illegible]

ہندی کی ہزاروں کتابیں فروخت ہو چکی ہیں

[illegible]

[illegible]

دیتے ہیں۔ انہوں نے ہندی کی صرف و نحو پر سب سے پہلے قلم اٹھایا سب سے پہلے ہندی کی لغت لکھی۔ ہندی علم [illegible] اور تال کے اصولوں کی مفصل شرح لکھی۔ ہندی الفاظ اور صوت کو مروجہ عربی رسم الخط میں لکھنے کے قواعد [illegible] اختراع کئے علوم متداولہ مثلاً قیافہ و معاشرت پر بھی قلم فرسائی کی اس مجموعہ کا نام مؤلف نے تحفۃ الہند رکھا ہے [illegible] کتاب کو کلتاش خاں ملک حسین خوانی رضائی بھائی اورنگ زیب کی فہمائش پر جہاندار شاہ کے مطالعہ کے لئے لکھی [illegible] باقی حال مرزا خان کا نہیں کھلا۔

مرزا رفیع سوداؔ ابن مرزا محمد شفیع دہلوی سودا ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ سلمان قلی خاں سے تحصیل علم کی۔ خان آرزو کے کہنے سے اردو میں فکر سخن کرنے لگے۔ استاد زمانہ تھے۔ شاہ عالم نے ان سے اصلاح کلام لی۔ شہرت [illegible] سے شجاع الدولہ نے لکھنؤ طلب کیا۔ اس کے بعد نواب آصف الدولہ نے چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ ۷۰ برس کی عمر پاکر ۱۱۹۵ھ میں دنیا سے چل بسے۔ آپ کی نثر کا نمونہ یہ ہے۔

از دیباچہ کلیات سودا

ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو۔ پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ دُر ریختہ خامہ دو زباں اپنی سے صفحۂ کاغذ پر تحریر پائے۔ لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجاں روزگار کروں۔ تا زمانی ان اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین آفریں رہوں۔

تتمہ دور اوّل

تصانیف وتراجم

سنہ ھ تا سنہ ۱۲۰۰ھ

نمبر	اسمائے مصنفین	سنہ	تصانیف وتالیف	کیفیت
۱	قاضی خاں ملا نذر محمد دہلوی	۸۲۲ھ	ادات الفضلا موید الفضلا	
۲	شیخ لاڈ دہلوی	۹۲۵		

۱	شمسی داس	عہد اکبری	کوئی مالا	
۴	تان سین	"	سانگت سار	
۵	علامہ ناصر افضلی الہ آبادی	۱۰۵۰ھ	دیوان اردو	مولوی عبدالحق صاحب کے پاس ہے
۶	ملا عبدالواسع	۱۰۹۸	غرائب اللغات	
۷	ابن میر مہدی خاں	۱۱۱۲	مراۃ المستہلین	قلمی عہ
۸	منشی عبدالغنی بن جمال الدین	۱۱۱۳	روضہ کرم	" عسہ
۹	شیخ وجیہ الدین وجدی	۱۱۱۵	ترجمہ منطق الطیر	" عسہ
۱۰	پریتم لال مرادآبادی	۱۱۴۰	پیم لیلا	" سہ
۱۱	محمد اسمٰعیل امروہوی	۱۱۰۵	مثنوی	کتب خانہ مولوی عبدالحق اورنگ آبادی
۱۲	شاہ مبارک آبرو	۱۱۴۰	مثنوی و دیوان	مطبوعہ دیوان غدر سے پہلے تک تھا کل رعنا
۱۳	شاہ عزیزاللہ	۱۱۴۳	چراغ ابدی تفسیر	قلمی عسہ
۱۴	شاہ حکیم اللہ جہاں آبادی	۱۱۴۴	عشرہ کاملہ	
۱۵	سید محمد چشتی آزاد	۱۱۵۴	عین الحلاوت	قلمی سہ
۱۶	میر نوازش علی مشہدی	۱۱۷۵	روضۃ الاطہار	قلمی عسہ
۱۷	خواجہ امانی دہلوی	۱۱۷۷	دیوان	مطبوعہ خمخانۂ جاوید حصہ اول
۱۸	"	۱۱۸۶	اعجاز احمد منظوم (سیر)	"
۱۹	نادر علی شاہ قادری	۱۱۹۰	رسالہ تصوف	قلمی عسہ
۲۰	محمد ولی اللہ قادری	۱۱۹۵	معرفت السلوک	قلمی عسہ
۲۱	مولوی قدرعالم بن بدرعالم	۱۱۹۹	نعتہ محفوظ خانی	قلمی عسہ
۲۲	حضرت درد دہلوی	۱۱۹۹	دیوان	
۲۳	مولوی عبداللہ دہلوی	۱۱۸۲	ترجمہ مثنوی مولانا روم منظوم	
۲۴	مرزا محمد خاں بن فخرالدین دہلوی	۱۱۲۵	تحفۃ الہند	
۲۵	محمد نجیب امیٹھوی	۱۱۲۲	رسالہ نجیبی	

عہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد عسہ کتب خانہ الحسن محمد یوسفی عسہ کتب خانہ شیب محمدیہ آگرہ۔

میر محمد عطا حسین خاں تحسین مخاطب مرصع رقم باپ کا نام میر باقر خاں شوق جو امرائے اٹاوہ سے تھے۔ تحسین علوم رسمیہ سے واقف تھے۔ بزرگوں نے تیموری دربار سے التفا پایا تھا جس پر گذر تھی۔ نواب مبارز الملک افتخار الدولہ جنرل اسمتھ بہادر صولت جنگ سپہ سالار افواج انگریزی نے تحسین کی خدمات لے لیں۔ جنرل صاحب کلکتہ جانے لگے ان کو بھی ہمراہ لیا۔ دریائی سفر تھا۔ راہ میں قصص و حکایات میں گذارا۔ صاحب بہادر خوش ہوئے ولایت جاتے ہوئے ان کو صوبہ عظیم آباد میں نظامت کے مقدمات کی مختاری عطا کی۔ کچھ عرصہ بعد وطن آئے۔ مگر برہان الملک نواب شجاع الدولہ نے فیض آباد طلب کر لیا وہیں ۱۱۹۸ھ میں چہار درویش کا ترجمہ "نوطرز مرصع" کے نام سے کیا۔ تاریخ وفات نہ معلوم ہو سکی۔ انشائے تحسین اور ضوابط انگریزی تواریخ فارسی یادگار سے ہیں

نمونہ "نوطرز مرصع"

آغاز قصہ درویش اوّل

چنانچہ رفیق اوّل نے غزال رعنائی اس داستان ندرت بیان اور واردات احوال صدق و مقال اپنی کی تین بیچ چراگاہ مجلس کے یوں جولاں کرعرصہ تقریر کی کہا۔

بند مسدس

دوستوں دل سے سنوں حال دل افگار کے تین
شرح افسانۂ غم عشق کے بیمار کے تین
قصہ بے سروسامانی اس خوار کے تین
حالت گریہ اس دیدۂ خونبار کے تین
تم کو مشفق سے جو پاتا ہوں غمخوار اپنا
بس بجا ہے جو کروں درد کا اظہار اپنا

اے یاران غمگسار مولد اس سرگشتہ بادیہ آشوب و فتن کی بیچ خطۂ پاک یمن کی ہے۔ اور والد اس عاجز کا ملک التجار نامی نہایت مالدار اور آسودہ روزگار پیشہ تجارت سے اس قدر گنج وافر بیچ بساط جمعیت کے موجود رکھتا تھا کہ شاید صراف سپہر کا بھی صندوق کہکشاں کی خزانہ ستاروں کا جمع نہ رکھتا ہو

سید شاہ حقانی نبیرۂ شاہ سید برکت اللہ مارہروی علمائے عصر سے اکتساب علم کیا فن تفسیر میں اہم عبارت

نمونہ ترجمہ آیت آخر سورۂ بقر

"[illegible] میں نہ ڈالے گا خدائے تعالیٰ کسی کو مگر موافق طاقت اس کی کے اس کو ہی جو عمل کیا اور اوپر اس کے ہے جو گناہ کیا۔ اے پروردگار میرے عذاب مت پکڑ تو مجھ پر جو بھول جاؤں میں یا خطا کروں میں"

حکیم غلام امام اکبرآبادی علم و فضل کے ساتھ فن طب میں مہارت کامل تھی۔ کچھ عرصہ تک طبیب شاہی رہے سب سے پہلے اردو میں ترجمہ چہل حدیث مرتب کیا۔ جو ۱۲۰۶ھ میں شایع ہوا۔ اس کے بعد ہیئت میں منتخب النجوم تصنیف کی۔ جس کی تکمیل ۱۲۰۸ھ میں ہوئی۔ تاریخ وفات کا پتہ نہ چلا۔

مرزا محمد حسین متخلص قتیل اصل نام دیوالی سنگھ تھا۔ آپ کے اسلاف کایستہ تھے فریدآباد وطن تھا۔ علم و فضل سے آراستہ فارسی میں یگانہ روزگار ہستی تھی زباندانی کا شہرہ تھا۔ مولوی غلام امام شہید سے آپ کے تلامذہ تھے میر انشاء اللہ خاں کے احباب خاص تھے۔ دریائے لطافت کا دوسرا حصہ منطق عروض و قافیہ و معانی و بیان مرزا کا تالیف کیا ہوا ہے۔ دربار اودھ سے متعلق رہے۔ شجرۃ الامانی نہر الفصاحت۔ چار شربت مرزا کی یادگار سے ہیں۔ آپ کے شاگرد خواجہ امدادالدین نے مرزا کے خطوط ۱۲۳۲ھ میں جمع کرکے معدن الفوائد کے نام سے شایع کئے اس میں حمد و نعت عربی و فارسی و ترکی و ہندی (اردو) میں مرزا نے تحریر کی ہیں۔ ہندی کا نمونہ پیش ہے۔ ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی

"بہت بندگی اور بہت غلامی کے لایق وہ مبارک جناب ہے کہ اوسکو خدائے برتر نے اپنا پیغمبر کیا اور تمام فاضلوں اور عالموں اور آدمیوں کو اوس کی امت کیا۔ سبحان اللہ اس بزرگ درگاہ کا دیکھنے والا ہوں میں کہ مری ہدایت کے راہ کا دکھلانے والا ہے اور سعادت کی منزل کا خضر ہے جو کہ شک کے دریا سخن دور کرنے والا ہے۔ اوس کی رواں تقریر ہے"

میر انشاء اللہ خاں بن حکیم ماشاء اللہ خاں ان کے معزز اسلاف سمرقند سے کشمیر اور وہاں سے دہلی آئے۔ میر ماشاء اللہ خاں دربار شاہی کے طبیب تھے۔ آخر عمر میں مرشدآباد چلے گئے۔

انشاء اللہ خاں نے باپ کے سائے میں نشوونما پائی۔ علوم مروجہ سے واقف تھے۔ علمی ذوق کے ساتھ شاعرانہ شوق تھا۔ لطیفہ سنجی و شوخ مزاجی رفیق طبیعت تھی۔ مرشدآباد سے دلی آئے۔ شاہ عالم سے رسائی ہوئی [illegible] بال ہوگئے کچھ عرصہ بعد لکھنؤ گئے۔ سلیمان شکوہ کی رفاقت اختیار کی۔ علامہ تفضل حسین خاں کی وساطت سے نواب سعادت علی خاں کے مصاحب ہوگئے۔ مگر آخر میں نہ بہی گوشہ نشینی اختیار کی اور غربت میں ۱۲۳۳ھ کو راہی ملک بقا ہوئے